مسلسل اشاعت کے 60 سال

رجب المرجب ۱۴۴۷ھ
جنوری ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- عظمتِ قرآن (۲) از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- آیت الکرسی: فضیلت، مفہوم اور تقاضے
- فیض حمید کو سزا: احتساب کی ایک نئی روایت؟
- خود احتسابی
- وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا
- اسماء اللہ الحسنیٰ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

دیدہ زیب ٹائٹل ۔ مضبوط جلد ۔ 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1500 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3
maktaba@tanzeem.org   0301-1115348

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ: ۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد	:	75
شمارہ	:	1
رجب المرجب		1447ھ
جنوری		2026ء
فی شمارہ	:	60 روپے
سالانہ زرِتعاون	:	600 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5
فیض حمید کو سزا: احتساب کی ایک نئی روایت؟ — رضاء الحق

درسِ قرآن 9
سُوۡرَۃُ الۡبَقَرَۃ (۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ابوظبی سیریز 33
عظمتِ قرآن (۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب 60
آیت الکرسی: فضیلت، مفہوم اور تقاضے — شجاع الدین شیخ

ظروف و احوال 73
خود احتسابی — ایوب بیگ مرزا

حسنِ مُعاشرت 82
وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

حقیقتِ دین 92
اسماء اللہ الحسنٰی (۶) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فیض حمید کو سزا: احتساب کی ایک نئی روایت؟

لیفٹیننٹ جنرل (ر) فیض حمید کو ۱۴ سال قید ہونے پر جس طرح قوم کے خوشیاں منانے کی خبریں آ رہی ہیں اُس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں ’’انصاف‘‘ ہونے لگا ہے۔ فوجی عدالت (جس کی کارروائی کی تو کسی کو خبر نہیں) کا فیصلہ آنے سے پہلے تک تو ملک میں صورتِ حال یقیناً یہی تھی کہ سزا صرف اور صرف غریب اور پس ماندہ طبقے کے لوگوں کو مل رہی تھی۔ کہیں کسی غریب دکاندار کو سڑک پر مال رکھنے پر پولیس اہل کار سزا دے رہا تھا تو کہیں ہیلمٹ نہ پہننے پر چار پانچ ٹریفک پولیس وارڈن سفید پوش نوجوان کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے سزا دے رہے تھے۔ دوسری طرف پاکستان کے لوگ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ایک اعلیٰ عہدیدار کا کمسن بچہ اپنی زور آور ڈرائیونگ سے کسی کو کچل دیتا ہے اور اُس کو کوئی سزا دینے یا سرزنش کرنے کی بجائے مقتول کے اہلِ خانہ اسے ’’معصوم بچہ‘‘ سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔ ایسی ’’معافی‘‘ کی مثالوں سے ہماری عدالتی تاریخ بھری پڑی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فیض حمید کی سزا نے سب بدل دیا؟ کسی حاضر سروس فوجی افسر کو سزا ملنے کی مثالیں تو موجود ہیں مگر وہ اتنی محدود ہیں کہ ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

فیض حمید کے خلاف یہ مقدّمہ سپریم کورٹ کے حکم پر چلایا گیا تھا۔ جنرل فیض حمید کو سزا کورٹ مارشل کارروائی مکمل ہونے کے بعد سنائی گئی۔ اُن کا مقدمہ کم وبیش ۱۵ ماہ تک فوجی عدالت میں چلتا رہا۔ اُس کی رپورٹنگ عام آدمی تک تو نہیں پہنچ سکی حتیٰ کہ فیصلے کا اصل متن جیسا کہ اکثر مقدمات میں دستیاب ہو جاتا ہے‘ وہ بھی کسی عام شہری نے نہیں دیکھا ہے۔ یقیناً اس میں کوئی مصلحت ہی ہو گی! بہرحال یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ فوجی عدالت نے اُنہیں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا‘ آفیشل سیکرٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پایا جس کی

وجہ سے ریاست کے راز اور مفادات متاثر ہوئے۔ اُنہیں اختیارات اور سرکاری وسائل کا غلط استعمال کرتے ہوئے پایا اور افراد کو نقصان پہنچاتے ہوئے پایا گیا۔ فوجی عدالت کا کہنا ہے کہ ملزم کو تمام قانونی حقوق فراہم کیے گئے جن میں اپنی پسند کے مطابق دفاع کرنا بھی شامل تھا۔ مقدمے میں نہ صرف ثبوت پیش کئے گئے بلکہ جرح بھی کی گئی اور مجرم کو آرمی چیف یا متعلقہ فورم کے سامنے اپیل کا حق بھی حاصل ہو گا۔

فیض حمید کو جن جرائم کی سزا دی گئی ہے‘ اخبارات کے آرکائیوز میں ایسی کئی خبریں‘ تبصرے اور مضامین موجود ہیں جنہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ایسے جرائم کے مرتکب اِس سے قبل بھی کئی افراد ہوئے ہیں مگر اُنہیں نہ تو فوجی عدالتوں میں لایا گیا اور نہ ہی اُن کے جرائم کو ثابت کیا گیا۔ بہرحال کسی فوجی یا سویلین کا کورٹ مارشل کوئی نئی بات نہیں ہے‘ بلکہ یہ ویسی ہی معمول کی بات ہے جیسی کسی سویلین عدالت میں کسی فوجداری کیس کا معاملہ ہو۔ عام آدمی کو یہ فرق صرف اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ سول عدالتوں میں لوگوں کو خواہ انصاف ہوتا ہوا نظر نہ بھی آئے مگر انصاف (یا انصاف کے خون) کی مکمل کارروائی اور فیصلہ کی تفصیل تک رسائی بہرحال حاصل ہو جاتی ہے۔ فوجی عدالتوں یا کورٹ مارشل کے کیسز عوام کو عموماً اس لیے بھی نظر نہیں آتے کہ ان کی کارروائی سے میڈیا کو دور رکھا جاتا ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں کسی سابق فوجی افسر کو سزا ملنے کا واقعہ اس سے قبل جنرل پرویز مشرف کا ہے جنہیں ۱۷ دسمبر ۲۰۱۹ء کو اسلام آباد کی خصوصی عدالت نے آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۶ کے تحت سنگین غداری کا مجرم قرار دیا اور اُنہیں سزائے موت کا حکم دیا گیا۔ اس سزا پر عمل درآمد نہیں ہو سکا کیونکہ عدالت کے حکم سنانے کے وقت وہ پاکستان میں موجود نہیں تھے۔ لاہور ہائی کورٹ نے ۲۰۲۰ء میں اُس خصوصی عدالت کے قیام کو غیر آئینی قرار دے کر فیصلہ ہی کالعدم کر دیا اور یوں عملی طور پر یہ سزا نافذ نہ ہو سکی۔ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے جب وہ پاکستان آئے تو اچھے خاصے سمجھدار لوگ بھی یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں پھانسی کے پھندے پر لٹکانا چاہیے جبکہ قانون کی نظر میں وہ معصوم تھے۔ اُن کے جسدِ خاکی کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔

نوّے کی دہائی میں پاکستان بحریہ کے سابق چیف آف نیول اسٹاف ایڈمرل منصور الحق

کا نام بدعنوانی کے مقدمات میں لیا جاتا رہا۔ منصور الحق نے پاکستان نیوی میں ۱۹۵۴ء میں خدمات شروع کیں اور بعد میں پاکستان نیوی کے سب سے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ اُنہوں نے پاک بحریہ کے دفاعی سودوں میں کمیشن وصول کیا' خصوصاً فرانس سے آبدوزوں اور بحری جہازوں کی خریداری کے معاملات میں' جس سے ملکی خزانے کو نقصان پہنچا۔ اِن الزامات کے باعث اُنہیں جون ۱۹۹۷ء میں قبل از وقت ریٹائر کیا گیا۔ ان کے رینکس' انعامات' پنشن اور سروس مراعات بھی واپس لے لی گئیں۔ ۲۰۰۱ء میں قانونی کارروائی کے نتیجے میں وہ امریکہ میں گرفتار ہوئے اور اُنہیں پاکستان میں مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن پر مقدمہ فوجی عدالت کی بجائے احتساب عدالت میں چلا' جس میں اُنہیں سات سال قید اور جرمانے کا حکم سنایا گیا۔ بعد میں پلی بارگین (معاہدہ) کے تحت تقریباً ۷.۵ ملین امریکی ڈالر جمع کروائے' جس کے بدلے میں اُن پر کئی مقدمات ختم ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لیفٹیننٹ جنرل فیض حمید کو ۱۴ سال قید بامشقت کی سزا سنا کر عسکری اداروں میں خود احتسابی کی ایک اچھی روایت قائم کی گئی ہے۔ اسلام ہمیں واضح حکم دیتا ہے کہ کوئی شخص چاہے کتنے ہی بڑے عہدے پر فائز کیوں نہ ہو' وہ احتساب سے مبرّا نہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ نے اور اُن کے وصال کے بعد خلفاءِ راشدین ؓ نے اس دینی اصول کی عملی مثالیں قائم کر کے دکھائیں' جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم قبیلے کے ایک بڑے خاندان کی عورت پر جب چوری کا جرم ثابت ہوا اور آپ ﷺ نے اُس پر حد نافذ کی تو کچھ لوگوں نے اُس کے حسب ونسب کی بنیاد پر اُسے معاف کرنے کی سفارش کی۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اِس لیے بھی ہلاک ہوئے کہ جب اُن میں کوئی معزز شخص جرم کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی عام آدمی جرم کرتا تو اُسے سزا دیتے تھے۔ اگر (بالفرضِ محال) فاطمہؓ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتیں تو میں اُن پر بھی ہاتھ کاٹنے کی قرآنی حد نافذ کرتا۔'' خلفاء راشدینؓ کے دور میں بھی بلاتفریق احتساب کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

پاکستان کی تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ سے بڑھ کر کوئی بڑا المیہ نہیں ہے۔ قانونی اور عدالتی معیار پر دیکھیں تو کسی بھی بڑے ذمہ دار کو باضابطہ سزا نہیں دی گئی۔ ۱۹۷۲ء میں چیف جسٹس

حمود الرحمٰن کی سربراہی میں کمیشن قائم ہوا' جس نے فوجی اور سیاسی قیادت کی سنگین غلطیوں' نااہلی' بدعنوانی اور اخلاقی جرائم کی نشاندہی کی۔ بعض جرنیلوں کے کورٹ مارشل کی سفارش کی' لیکن کمیشن کی سفارشات پر مکمل عمل نہیں ہوا۔ ان میں سب سے اہم جنرل یحییٰ خان تھے۔ اُنہیں کوئی عدالتی سزا نہیں ہوئی' فقط اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ نظر بندی ہوئی' مگر بعد میں رہا کر دیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی جو مشرقی پاکستان میں فوجی کمانڈر تھے' جنگی قیدی بنے۔ بعد میں پاکستان واپس آ گئے' اُن کا کوئی کورٹ مارشل نہیں ہوا اور ریٹائرمنٹ کے بعد خاموش زندگی گزاری۔ حقیقت یہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے ذمہ داران تاریخ میں تو شاید ملک کے بدترین مجرم ٹھہرے' مگر قانون کی کسی بھی عدالت میں اُنہیں مجرم نہیں ٹھہرایا گیا۔

کئی صحافیوں نے انکشاف کیا ہے کہ فیض حمید نے اُن پر کب کب اور کس کس طرح سے دباؤ ڈالا جن میں سے بعض تو دباؤ میں آ گئے اور بعض نے بیچ کی راہ اختیار کی۔ صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون تصور کیا جاتا ہے' جسے بدقسمتی سے کھوکھلا کیا جا چکا ہے۔ ملک کا استحکام اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ صحافی اور صحافت کو کسی بھی طرح دباؤ میں نہ لایا جائے۔ ہماری رائے میں ملک کی بقا اور سلامتی کے لیے ناگزیر ہے کہ ریاستی ادارے آئین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ ریاست کو ماں کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ملکی سلامتی کے لیے لازم ہے کہ سب اپنی غلطیوں کو تسلیم کریں۔

قصہ کوتاہ' ایک سابق جرنیل کو اُس کے جرائم ثابت ہونے پر سزا دینے سے جس اچھی روایت کا آغاز کیا گیا ہے' اُس کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ مجرم خواہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہو' اُسے احتساب کے دائرہ میں لایا جائے۔ سیاسی اور عسکری وعدالتی بیوروکریسی کے دیگر اہم عہدوں پر فائز ماضی اور حال کے تمام مجرموں' بالخصوص جنہوں نے کرپشن کر کے قومی خزانہ کو لوٹا ہے' کو قانون اپنی گرفت میں لے۔ اُنہیں نہ صرف قرار واقعی سزا دی جائے بلکہ اُن سے لوٹا ہوا پیسہ بھی برآمد کر کے عوام کی فلاح وبہبود پر خرچ کیا جائے۔

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۴)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیات ۸ تا ۱۶

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِيْنَ (٨) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ (٩) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (١٠) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي
الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (١١) اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ
وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (١٢) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا
اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا
يَعْلَمُوْنَ (١٣) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى
شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (١٤) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ
بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (١٥) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ
بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (١٦)

سورۂ لقمان کی ابتدائی آیات سے تقابل

گزشتہ نشست میں ہم نے سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع کا مطالعہ مکمل کر لیا تھا، لیکن اُس سلسلہ کا ایک قرض مجھے ادا کرنا ہے۔ مَیں نے سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع کے مضامین کی نظیر یا اُس کے مثنیٰ کے طور پر سورۂ یٰسٓ کے پہلے رکوع کی آیات کا تقابلی مطالعہ کرایا تھا، اس لیے کہ جو الفاظ سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع میں آئے ہیں: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (٦)﴾ بعینہٖ یہی الفاظ سورۂ یٰسٓ (آیت ۱۰) میں بھی آئے ہیں۔ اس اعتبار سے ان دونوں مقامات میں باہم بڑی مشابہت ہے۔ پھر سورۃ البقرہ کے شروع میں آنے والے الفاظ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ ایک رائے کے مطابق یہ بِ ظرف کی ہے، یعنی غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانا، اس کی مثال بھی سورۂ یٰسٓ میں موجود ہے: ﴿وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ﴾ وہ لوگ کہ جو رحمٰن سے خوف رکھتے ہیں، اس کے باوجود کہ غیب میں ہیں۔ یہ چند چیزیں ایسی تھیں جو ان دونوں مقامات کے مابین مشترک ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ آیات کا مثنیٰ قرآن حکیم میں سورۂ لقمان کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ حسنِ اتفاق یہ بھی ہے کہ جیسے سورۃ البقرہ کا آغاز ہوا ہے حروفِ مقطعات الٓمٓ سے ویسے ہی سورۂ لقمان کا بھی آغاز الٓمٓ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ آیات اور سورۂ لقمان کی ابتدائی پانچ آیات میں کتنی گہری مشابہت ہے۔

﴿الٓمٓ (١) تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (٢) هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (٣)
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (٤)
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٥)﴾

آپ نے نوٹ کیا کہ سورۃ البقرۃ کی پانچویں آیت بھی انہی الفاظ پر ختم ہوئی اور یہاں بھی بعینہٖ وہی الفاظ ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٥)﴾ حروفِ مقطعات بھی وہی ہیں۔ وہاں آغاز میں الفاظ آئے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ یہاں فرمایا: ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (٢)﴾ ”یہ آیات ہیں اس کتاب کی جو حکمت بھری، محکم اور پختہ ہے۔“ یہ تقابلی مطالعہ بہت دلچسپی کا حامل ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (٢)﴾ یہاں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (٣)﴾ امرِ واقعہ ہے کہ اسلام، ایمان اور احسان میں ”احسان“ کا درجہ بلندترین ہے۔ تقویٰ درحقیقت وہ روحِ باطنی ہے جو اگر ان تینوں مدارج اور مراحل پر

موجود ہے تو حقیقتاً اسلام اسلام ہے‘ ایمان ایمان ہے‘ احسان احسان ہے۔ البتہ بلند ترین درجہ احسان ہے۔ یہاں سورۂ لقمان میں لِلْمُتَّقِيْنَ کی بجائے لِلْمُحْسِنِيْنَ فرمایا‘ لٰہذا محض ہدایت کے لفظ پر کفایت نہیں کیا بلکہ فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ③﴾۔ اس کے بعد وہاں تھا: ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③﴾ اور یہاں ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ وہاں انفاق اور یہاں زکوٰۃ کی اصطلاح لائی گئی۔ پھر وہاں فرمایا: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④﴾ اور یہاں ہے: ﴿وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④﴾۔

البتہ خاص طور پر یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ آیات کا ایک مضمون ایسا ہے جو سورۂ لقمان کی ابتدائی پانچ آیات میں بالکل نہیں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾۔ سورۃ البقرہ میں جو یہ الفاظ آئے ہیں اور یہاں نہیں آئے‘ اس کا سبب نوٹ کر لیجیے۔ سورۂ لقمان مکی سورت ہے اور اہلِ مکہ کو جو دعوت دی جا رہی تھی وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت تھی۔ اہلِ مکہ چونکہ آپ ﷺ سے پہلے کی کسی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے تھے‘ لٰہذا اس کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ محض حضور ﷺ پر اور قرآن حکیم پر ایمان لے آنا ان کے لیے کفایت کرتا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ البقرہ ''سُوْرَةُ الْاُمَّتَيْن'' ہے۔ اس کے نصف اوّل میں تمام تر خطاب اہل کتاب بالخصوص یہود سے ہے‘ چاہے صراحتاً ہے یا اشارۃً‘ اور اُن کے ضمن میں تعریض کے طور پر یہ کہنے کی ضرورت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ یعنی جو حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے ہیں اور جنہوں نے قرآن حکیم کی ہدایت سے استفادہ کیا ہے ان میں وہ تنگ نظری نہیں ہے کہ صرف اُسی کو مانیں جو حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے‘ بلکہ پوری وسعتِ قلب کے ساتھ وہ ایمان رکھتے ہیں ان تمام کتابوں پر بھی جو آنحضور ﷺ سے پہلے نازل ہوئیں۔ اس میں درحقیقت یہود پر تعریض ہے کہ تمہارے اندر وہ تنگ نظری اور تعصب ہے‘ تم اس تنگ دلی میں گرفتار ہو کہ صرف اپنی کتاب کو ماننے

پر ہی اکتفا کر رہے ہو اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لا رہے ہو۔ چونکہ سورۃ البقرہ مدنی سورت ہے اور سورۃ لقمان مکی سورت‘ اس اعتبار سے یہ فرق قابلِ ذکر ہے کہ یہاں سورۂ لقمان میں وہ مضمون نہیں ہے جو سورۃ البقرہ میں آیا ہے۔

آج کے ہمارے سبق کے اعتبار سے بھی اہم بات یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے پہلے چار رکوعوں میں بنی اسرائیل سے صراحتاً خطاب کہیں نہیں ہے‘ اگرچہ اصلاً روئے سخن انہی کی طرف ہے۔ اس سورت کے پورے نصف اوّل یعنی اٹھارہویں رکوع تک میں سے صرف دس درمیانی رکوع وہ ہیں جن میں براہِ راست خطاب ہے۔ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ﴾ (آیت ۴۰) سے بات شروع ہو کر پندرہویں رکوع تک مسلسل گفتگو چلی ہے۔ پہلے چار رکوع اور اس کے بعد کے چار رکوع میں اگرچہ صراحتاً خطاب یہود یا بنی اسرائیل سے نہیں ہے لیکن یہاں بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے۔

آیات کا رواں ترجمہ

اب ہم سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع کا مطالعہ شروع کر رہے ہیں۔ زیر مطالعہ آیات کا پہلے ایک رواں ترجمہ کر لیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ان میں کیا مضامین آ رہے ہیں‘ پھر کچھ تمہیدی گفتگو کرنا ہوگی۔ ایک اہم مسئلہ ہے کہ یہاں کچھ لوگوں کا ذکر ہے لیکن انہیں باقاعدہ معیّن نہیں کیا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں‘ اس کے لیے غور کرنا پڑے گا۔ جو باتیں یہاں کہی جا رہی ہیں انہی کے حوالے سے معیّن کرنا ہوگا کہ یہاں خطاب کن سے ہو رہا ہے۔

فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اور لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یوم آخرت پر'' یا ''ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر''— یہ دونوں ترجمے میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ اس ضمن میں دو مختلف آراء ہیں کہ یہاں خطاب کن سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ترجمے ان دونوں آراء سے مطابقت رکھنے والے ہیں۔ ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧﴾

’’درآنحالیکہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔‘‘

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ ’’وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو‘‘ ﴿وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَھُمْ﴾ ’’اور نہیں دھوکا دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو‘‘ ﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۹﴾ ’’لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔‘‘ یا ’’لیکن وہ غور نہیں کرتے۔‘‘ یہ بھی دو مختلف تراجم ہیں۔

﴿فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ﴾ ’’اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے‘‘ یا ’’ایک روگ تھا‘‘ ﴿فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ﴾ ’’تو بڑھا دیا اللہ نے ان کے لیے ان کے مرض کو۔‘‘ ان کی بیماری میں اور ان کے روگ مَیں اضافہ کر دیا۔ ﴿وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۱۰﴾ ’’اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس جھوٹ کے سبب جو وہ بولتے رہے۔‘‘ یا دوسرا ترجمہ ہے: ’’اس جھوٹ کے سبب جو وہ کہتے رہے۔‘‘ اس کی وضاحت بعد میں ہو گی کہ مَیں یہ دو ترجمے کیوں بیان کر رہا ہوں۔

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ ’’اور جب ان سے کہا جاتا ہے مت فساد مچاؤ زمین میں‘‘ ﴿قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۱۱﴾ ’’وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔‘‘ ہم تو مصلحین ہیں۔ ﴿اَلَاۤ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ‘ یقیناً وہی مفسد ہیں‘‘ ﴿وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۱۲﴾ ’’لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔‘‘ وہ اس کی سمجھ نہیں رکھتے‘ اُنہیں اس کا احساس نہیں ہے۔

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ’’اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے کہ ایمان لائے دوسرے لوگ‘‘ یا ’’جیسے کہ ایمان لائے سب لوگ‘‘ ﴿قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ﴾ ’’وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جیسے کہ احمق لوگ ایمان لائے ہیں!‘‘ ناسمجھ‘ بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔ ﴿اَلَاۤ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! (سن رکھو!) یقیناً وہی احمق ہیں‘‘ وہی ناسمجھ ہیں ﴿وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۱۳﴾ ’’لیکن وہ علم نہیں رکھتے۔‘‘

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ﴾ ’’اور جب ان کی ملاقات ہوتی ہے (یا

وہ ملاقات کرتے ہیں) اہلِ ایمان سے‘ تو کہتے ہیں ہم ایمان رکھتے ہیں (یا ہم ایمان لے آئے)۔‘‘ ﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ ۙ﴾ ’’اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں اپنے ان شیطانوں (اور سرداروں) کی مجلسوں میں‘‘ ﴿قَالُوْۤا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ﴾ ’’وہ کہتے ہیں ہم تو آپ ہی کے ساتھ ہیں‘‘ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَہْزِءُوْنَ ۱۴﴾ ’’ہم تو صرف استہزاء کر رہے ہیں۔‘‘ مذاق کر رہے ہیں‘ تمسخر کر رہے ہیں۔ ﴿اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ﴾ ’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے‘‘ یا ’’اللہ ان کا مذاق اُڑا رہا ہے‘‘ ﴿وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَھُوْنَ ۱۵﴾ ’’اور اُن کو ڈھیل دے رہا ہے (ان کی رسّی دراز کر رہا ہے) کہ وہ اپنی سرکشی (اور نافرمانی) میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں اندھے ہو کر بغیر بصیرت کے۔‘‘ یعنی اندھے بہرے ہو کر۔ اس کا مفہوم تفصیل سے بعد میں عرض کیا جائے گا۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی﴾ ’’یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے (ہدایت کے عوض) گمراہی خرید لی۔‘‘ ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ﴾ ’’تو نہ مفید ہوئی اُن کے حق میں اُن کی یہ تجارت۔‘‘ اُن کا یہ سودا ان کے لیے مفید اور نفع بخش نہ ہوا۔ ﴿وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ ۱۶﴾ ’’اور نہ ہی ہوئے وہ ہدایت پانے والے۔‘‘ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ ۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ ۔

تمہیدی گفتگو

ان آیات میں جس گروہ کا ذکر ہے‘ تقریباً تمام مفسّرین نے اس کا مصداق منافقین کو قرار دیا ہے۔ گویا کہ سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع میں دو گروہوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ایک مؤمنین صادقین جنہوں نے قرآن حکیم کی ہدایت سے کما حقّہ استفادہ کیا۔ درخت کو اُس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے‘ چنانچہ ہدایتِ قرآنی کے نتائج وثمرات تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو ابوبکر‘ عمر‘ عثمان اور علی کو‘ دیکھ لو حمزہ کو‘ ابوعبیدہ بن الجراح کو‘ طلحہ کو‘ زبیر کو‘ مصعب بن عمیر کو رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین۔ یہ وہ جماعت ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّہِمْ ۗ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۵﴾۔ دوسرے گروہ کے لیے اگرچہ الفاظ عام ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ لیکن اس سے مراد خاص ہے یعنی کفارِ قریش

بالخصوص ان کے سردار جو کفر پر اَڑ گئے تھے۔ تعصب‘ تکبر اور حسد کی بنا پر شقاق اور ضِدم ضِدا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کے بارے میں فرما دیا گیا کہ اے نبی ﷺ‘ آپ انہیں خواہ کتنا ہی سمجھائیں‘ خبردار کریں‘ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں: ﴿سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۶﴾ اس میں اشارہ ہو گیا ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کی طرف۔

اب ایک تیسری جماعت‘ مؤمنین صادقین اور کھلم کھلا جو معاندین ہیں‘ جو دشمن ہیں‘ کھلم کھلا مخالفین ہیں‘ ان کے بین بین کی ایک جماعت ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کے لیے اصطلاحی نام ہے ’’منافق‘‘۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سارا بیان اسی گروہ کا ہے‘ اگرچہ یہاں لفظ منافق کہیں نہیں آیا۔ نفاق کا لفظ بھی کہیں نہیں آیا‘ لیکن یہ کہ اس پر تقریباً اجماع ہے۔ امام رازیؒ نے تو کہا ہے: ’’اجمع المفسرون‘‘ یعنی اس پر اجماع ہے تمام مفسرین کا کہ یہاں مراد منافقین ہیں۔ ان آیات کا جو ترجمہ آپ کے سامنے آیا ہے یہ خود بھی بول رہا ہے‘ بغیر نام لیے گویا کہ اشارہ ہو رہا ہے کہ کن لوگوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ کن کے خصائص ہیں‘ کن کی صفات ہیں‘ کن کا طرزِ عمل ہے‘ کن کے اقوال ہیں جو نقل کیے جا رہے ہیں!

تاہم ایک منفرد رائے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے پیش کی ہے‘ اور مجھے اس میں بھی کچھ وزن نظر آتا ہے‘ چنانچہ مَیں اسے بھی پیش کر رہا ہوں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ درحقیقت ان آیات میں یہود‘ بالخصوص ان کے علماء کا تذکرہ ہے۔ یہ ان کی تصویر ہے جو ان الفاظ میں کھینچی گئی۔ اس رائے کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ آپ باقی پوری سورۃ البقرۃ کھنگال جایئے‘ منافقین کا تذکرہ کہیں نہیں آ رہا۔ نہ کہیں لفظ نفاق آیا ہے نہ لفظِ منافق۔ یہ تو سورۂ آلِ عمران میں آئے گا یا پھر بڑے شرح و بسط کے ساتھ سورۃ النساء میں مرضِ نفاق پر گفتگو ہوئی ہے۔ پھر سب سے زیادہ سورۃ التوبہ میں منافقین کا ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مدنی سورتیں جو بعد کے دور کی ہیں‘ اُن میں لفظ منافق موجود ہے اور منافقین کی صفات بیان کی گئی ہیں‘ لیکن اس سورۂ مبارکہ میں جو خطاب ہے وہ یا تو یہود

سے ہے یا اہلِ ایمان سے۔ نصفِ اوّل میں تمام تر خطاب یہود سے ہے اور نصفِ ثانی میں تمام تر خطاب اہلِ ایمان سے‘ مسلمانوں سے ہے۔ اس کی گویا اس بات سے زیادہ مناسبت ہے کہ یہاں بھی اشارہ یہود کی طرف کیا جا رہا ہے۔

ایک اور بڑی دلیل بھی اس میں مضمر ہے‘ اس لیے کہ ان کا جو دعویٰ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ اس میں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا دعویٰ ہی نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ جو نقل کیا گیا کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر‘ یہاں صراحت کے ساتھ ان کے حضور ﷺ پر ایمان لانے کی بات نہیں کی گئی‘ جبکہ منافقین کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ پورے شدّومدّ کے ساتھ کہتے تھے کہ ہم محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ جیسے کہ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت ہی یہ ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ۝۱﴾

’’(اے نبی ﷺ!) جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کس کو معلوم ہو گا کہ آپؐ اُس کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹ کہہ رہے ہیں۔‘‘

ان کا آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان کا دعویٰ تو ہے‘ لیکن درحقیقت انہیں ایمان حاصل نہیں۔ اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بات میں وزن نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ آگے چل کر سولھویں رکوع میں الفاظ آئے ہیں:

﴿فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوا ۚ﴾ (آیت ۱۳۷)

’’پھر اگر وہ ایمان لائیں اس طور سے جس طور سے کہ (اے مسلمانو!) تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔‘‘

تمہارا ایمان اللہ پر بھی ہے‘ آخرت پر بھی ہے اور سب سے بڑھ کر محمد رسول اللہ ﷺ پر ہے۔ اصولی اعتبار سے‘ نظری اعتبار سے‘ علمی اعتبار سے اصل ایمان ایمان باللہ ہے۔ ایمان

بالرسول یا ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرہ یا ایمان بالمعاد‘ یہ دونوں فروع (شاخیں) ہیں ایمان باللہ کی۔ رسالت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کی توسیع (extention) ہے اور آخرت اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ہے۔ اسی لیے ’’ایمانِ مجمل‘‘ میں صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان کا ذکر ہے: آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ کسی اور شے کا ذکر ہی نہیں۔ اسی طرح عملی اعتبار سے انسان کے رویّے کے درست ہونے کے اعتبار سے‘ اہم ترین ایمان ہے ایمان بالآخرۃ۔ آخرت پر یقین ہوگا تو آدمی سیدھا رہے گا۔ بولنے سے پہلے تولے گا‘ کوئی عمل کرنے سے پہلے سوچے گا کہ میرے لیے جائز ہے یا نہیں! اسی طرح جہاں تک قانونی ایمان کا تعلق ہے‘ اصل ایمان ہے ایمان بالرسولؐ۔ ایمان باللہ بھی وہی معتبر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے اُن اَسماء وصفات کے ساتھ ہو جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ ایمان بالآخرۃ بھی وہی معتبر ہوگا جو اُن تمام تفاصیل کے ساتھ ہو جس کا علم انسان کو نبوت ورسالت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ بعث بعد الموت‘ حشر ونشر‘ حساب کتاب‘ جزا وسزا‘ جنت و دوزخ‘ ان کی تفاصیل نبوت ورسالت ہی کے ذریعے سے انسان کے علم میں آسکتی ہیں۔

اس اعتبار سے نوٹ کیجیے کہ سولہویں رکوع میں ساری گفتگو اہل کتاب کے بارے میں ہو رہی ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ﴾

’’کہو: ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر‘ اور جو کچھ نازل کیا گیا ہماری جانب اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم‘ اسماعیل‘ اسحاق‘ یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف‘ اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو‘ اور جو کچھ دیا گیا تمام نبیوں کو اُن کے ربّ کی طرف سے۔ ہم اُن میں سے کسی کے مابین تفریق نہیں کرتے‘ اور ہم اُسی کے مطیع فرمان ہیں۔

پھر (اے مسلمانو!) اگر وہ (یہود ونصاریٰ) بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب وہ ہدایت پر ہوں گے۔‘‘

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ سورۃ البقرہ کے پورے نصف اوّل میں سارا روئے سخن یہود کی طرف ہے‘ چنانچہ اس اعتبار سے مجھے مولانا اصلاحی صاحب کی رائے میں کچھ وزن نظر آیا ہے۔

دونوں آراء میں تطابق

میرے نزدیک یہ دونوں موقف reconcile کرتے ہیں‘ اور وہ مطابقت (reconciliation) اس اصول کے حوالے سے ہوگی کہ قرآن کی ایک تاویلِ خاص ہے‘ ایک تاویلِ عام۔ تاویلِ خاص یہ ہے کہ آپ ان آیات کو اُس خاص سیاق وسباق (context) جن میں وہ نازل ہوئیں‘ وہ حالات کیا تھے‘ مخاطب کون تھے‘ اُس وقت کی کیفیات کیا تھیں‘ اس frame of reference میں رکھ کر اُن میں غور وفکر کریں۔ تاویلِ عام کے لیے اصول یہ ہے: الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب یعنی خصوصِ سبب کے حوالے سے اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ الفاظ پر اُن کے عموم کو پیشِ نظر رکھ کر تاویل کی جائے گی۔ اَبد الآباد کے لیے قرآن مجید اگر ہدایت نامہ ہے تو شانِ نزول سے ہٹ کر بھی عمومِ لفظی کے حوالے سے اس کے مفہوم کو سمجھا جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ تاویلِ عام کے اعتبار سے یہ آیات صد فی صد منافقین پر منطبق ہوتی ہیں‘ لیکن تاویلِ خاص کے اعتبار سے ان کا زیادہ انطباق یہود پر ہے‘ اس لیے کہ نفاق کا پودا تو ابھی بالکل شروع ہی میں تھا۔ اس پر تقریباً اجماع ہے کہ سورۃ البقرہ کا زمانہ نزول‘ چند استثناآت کو چھوڑ کر‘ ہجرت کے فوراً بعد سے غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک ہے۔ اس وقت تک نفاق ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھا‘ جو مدینہ میں پروان چڑھا۔ ایک مکی دَور کا نفاق تھا جبکہ ایک خاص مدنی دَور کا نفاق ہے‘ ان دونوں میں فرق ہے (بعد میں‘ ان شاء اللہ‘ میں اس کی وضاحت کر دوں گا) لیکن ابتدائی مدنی دور میں نفاق کی یہ پنیری درحقیقت یہود ہی کے زیرِ اثر (undergrowth) تھی۔ اصل میں تناور درخت علماءِ یہود تھے جن کا

مدینہ کے معاشرے پر بڑا اثر تھا۔ ان کے علم اور ان کے تدین کا بڑا شہرہ تھا کہ ان کے پاس شریعت ہے۔ یہ مہذّب ومتمدن لوگ ہیں۔ ان کے ہاں قاضی ہیں‘ ان کا قانون ہے جس کے تحت فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ صاحبِ کتاب ہیں‘ صاحبِ علم ہیں۔ چنانچہ اوس و خزرج کے لوگوں پر ان کا خاص رعب تھا اور وہ لوگ ان کے زیرِ اثر تھے۔ البتہ سیاسی اعتبار سے یہود دبے ہوئے تھے بمقابلہ اوس وخزرج کے‘ اور وہ یہی کہا کرتے تھے کہ اب آخری نبیؐ کے ظہور کا وقت قریب ہے‘ جب وہ آئیں گے اور انؐ کے ساتھ مل کر ہم تم سے مقابلہ کریں گے تو اے اوسیو اور خزرجیو! تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکو گے‘ تم ہم پر غالب نہ آسکو گے۔ بہرحال تہذیبی وتمدنی اور علمی اعتبار سے غلبہ یہود کا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں (منافقین اور یہود) ایک اعتبار سے ایک ہی شے ہیں‘ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

قرآن مجید نے یہاں بہت ہی حکمت اختیار فرمائی کہ نام لیے بغیر خصائص بیان کر دیے۔ ایک دروں بینی کی دعوت دی جارہی ہے کہ ہر شخص اپنا جائزہ لے کہ یہ ناپسندیدہ اوصاف کس پر منطبق رہے ہیں! جیسا کہ حضورﷺ کا بڑا حکیمانہ طرزِ عمل تھا کہ آپؐ اگر کچھ معیّن لوگوں پر تنقید بھی فرمانا چاہتے تو عموم کے الفاظ میں فرماتے: کیا ہو گیا ہے قوم کو‘ کیا ہو گیا ہے لوگوں کو کہ ایسا اور ایسا کر رہے ہیں! بجائے اس کے کہ معیّن کر دیا جائے کہ فلاں شخص نے یہ کیا غلط حرکت کی ہے‘ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب نشان دہی ہو جاتی ہے تو ضدم ضدا کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے‘ کچھ ہٹ دھرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اب رسوائی تو ہو ہی گئی (ع ہم پہ الزام تو ویسے بھی ہے‘ ایسے ہی سہی!)۔ اس طرح لازماً کچھ تناؤ آجاتا ہے اور ایک طرح کی ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی بجائے بہتر یہ ہے کہ جب تک اصلاح کی توقع ہو اس وقت تک کسی کو سرِعام رُسوا نہ کیا جائے بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں بات کی جائے کہ نشان دہی بھی ہو جائے۔ جس کے اندر بھی اصلاح پزیری کا کوئی مادہ ہے تو وہ خود اپنے گریبان میں جھانکے۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ ....﴾ ’’اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں.....‘‘ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ما بال اقوامٌ یفعلون کذا وکذا: ’’لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ ایسے ایسے کام

کر رہے ہیں!‘‘ قرآن کریم کا اور نبی اکرمﷺ کا یہ نہایت حکیمانہ انداز ہے۔

جب مَیں یہ مقام پڑھتا ہوں تو مجھے یاد آجاتا ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے میرے سکول کے دور میں نئی دہلی میں ’’کناٹ پیلس‘‘ ایک بڑی مارکیٹ ہوا کرتی تھی۔ وہاں ایک جوتوں کی دکان تھی جس کے باہر ایک بہت بڑا‘ کئی فٹ لمبا بوٹ لٹکا ہوا تھا اور اس کے ساتھ انگریزی کا بڑا پیارا جملہ لکھا ہوا تھا: ’’!Free to whom it fits‘‘ یعنی جس کے پاؤں میں یہ فٹ آئے وہ اسے مفت میں لے جائے! یہ پبلسٹی کا ایک خوبصورت انداز تھا۔ یہاں بھی قرآن مجید نے کردار نگاری کر دی ہے‘ ایک نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اب ہر شخص اپنا جائزہ لے لے کہ کہیں یہ اوصاف اور خصائص اس کے اندر تو موجود نہیں ہیں! ایک تو وہ انتہا ہے کہ جو حد سے گزر گئے: ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّلَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۷﴾﴾ اور ﴿ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾﴾ جو اُس حد کو پہنچ گیا اُس کا معاملہ جدا ہے لیکن جن میں کوئی اصلاح پزیری کی گنجائش ہے‘ کوئی مادہ موجود ہے وہ دروں بینی کریں‘ اپنے گریبان میں جھانکیں۔

اس اعتبار سے میرے نزدیک دونوں باتیں صحیح ہیں۔ تاویل خاص کے اعتبار سے کہ یہ آیات ایک خاص context میں نازل ہوئیں۔ سورۃ البقرۃ کے نصفِ اوّل میں روئے سخن جن کی جانب ہے اس کے اعتبار سے دیکھیں کہ یہاں مخاطب جو ہیں یا جن کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے (مشارالیہ) وہ یہود ہیں‘ بالخصوص ان کے علماء۔ اگر اس کے عموم کو لیں‘ عمومِ لفظ کو سامنے رکھیں‘ ابدالآباد کے لیے تو یہ منافقین پر منطبق ہوتی ہیں۔

دعوتِ انقلاب اور تین گروہ

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی نئی دعوت کے ردِّعمل میں‘ بالخصوص جبکہ وہ دعوت انقلابی ہو تو تین طرزِ عمل لازماً پیدا ہوں گے۔ ہمیشہ ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہمیشہ ہوں گے۔ ایک وہ لوگ جو اس دعوت کو اس کی face value پر کھلے دل کے ساتھ‘ پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ بات صحیح ہے لہٰذا ہم قبول کرتے ہیں۔ نئی دعوت جب بھی آئے گی تو ترک واختیار کا معاملہ ہوگا۔ جو اسے قبول کرے گا وہ اپنے پرانے معاشرے

سے کٹے گا۔ اس کو کچھ نئی باتیں قبول کرنی ہوں گی‘ پرانی چھوڑنی ہوں گی۔ اس کی بنا پر ایک تصادم ہوگا‘ کشمکش ہوگی‘ کشاکش ہوگی۔ یہ سارے مسائل آئیں گے۔ یہ تصادم کبھی passive بھی ہوسکتا ہے‘ کبھی active بھی۔ اس میں جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں‘ لیکن بہرحال کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جب ایک دفعہ قدم رکھ دیا تو پھر ع ''ہر چہ بادا باد‘ ما کشتی درآب انداختیم!'' کہ ہم نے تو اپنی کشتی پانی میں ڈال دی‘ اب جو ہو سو ہو۔ اب یہ کشتی تیرے گی تو ہم بھی تیریں گے‘ ڈوبے گی تو ہم بھی ڈوبیں گے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کشتی سے وابستہ کر دیا ہے۔

ان کے مقابلے میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی پرانی عصبیت اور تعصب پر اَڑ جاتے ہیں۔ وہ کھلم کھلا مقابلہ کرتے ہیں‘ مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا عناد اور شقاق بالکل سامنے کی شے ہوتا ہے۔ وہ سامنے سے وار کرتے ہیں‘ راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہ دوسرا طرزِ عمل ہے۔ جن کے اندر اپنے سابقہ عقائد و نظریات کے ساتھ عصبیت ہے وہ اس پر پختگی سے جم جاتے ہیں کہ ہم نئی بات کی مخالفت کریں گے۔

ان کے بین بین ایک تیسرا طبقہ بھی ہوتا ہے۔ انہیں نئی بات اچھی تو لگتی ہے‘ لیکن اسے قبول کرنے کے نتیجے میں جو کشاکش پیدا ہوئی کہ اب کچھ چھوڑنا پڑ رہا ہے‘ کچھ نئی چیزیں اختیار کرنا پڑ رہی ہیں‘ پرانی دوستیاں ٹوٹ رہی ہیں‘ پرانی رشتہ داریاں ختم ہو رہی ہیں‘ گھروں میں اب کشاکش شروع ہوگئی ہے‘ تصادم ہے‘ اس میں وہ ثابت قدم نہیں رہ پاتے اور مذبذب ہو کر رہ جاتے ہیں: ﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾ (النساء : ۱۴۳)۔ وہ ان دونوں طبقات کے درمیان مذبذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نہ اِدھر کے‘ نہ اُدھر کے۔ ان کی کوشش مصالحت کی ہوتی ہے کہ کسی طریقے سے یہ کشاکش شدت اختیار نہ کرے۔ کسی طرح رواداری‘ مصالحت اور صلحِ کُل کا انداز اختیار کیا جائے تاکہ کسی امتحان کا کوئی آخری مرحلہ نہ آئے کہ اب طے کرو یا اِدھر یا اُدھر! اس سے بچنے کے لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کوئی مفاہمت ہو جائے‘ کچھ give and take ہو جائے۔ اصل میں تو ان کے پیشِ نظر اپنا تحفظ ہے۔ جان و دل عزیز ہے‘ اپنے مفادات

عزیز ہیں‘ یا یہ کہ اگر کوئی چودھراہٹ ہے‘ سابقہ وابستگیوں کی بنا پر کوئی منصب یا منفعت حاصل ہے اس کو چھوڑنے پر طبیعت آمادہ نہیں۔ لیکن نام وہ لیں گے صلح کا‘ مصالحت کا‘ رواداری کا کہ دونوں باتیں ماننی چاہئیں۔

یہ تیسرا طبقہ ہر دَور میں رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جب بھی کسی معاشرے میں کوئی نئی دعوت سامنے آتی ہے‘ بالخصوص جو انقلابی ہو‘ یہ طبقہ وجود میں آجاتا ہے۔ کوئی ایسی دعوت بھی ہوسکتی ہے جو علمی و فکری ہو۔ ایک خیال یا نظریہ ہو جس کا اس ملک میں قائم نظام پر کوئی اثر نہیں پڑتا‘ کوئی ضرب نہیں لگتی۔ وہ ایک طرح کا cult ہے‘ محض ایک نظریاتی سا معاملہ ہے۔ ایک school of thought ہے‘ لیکن یہ کہ اس سے نظام پر زد پڑ رہی ہو۔ ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!'' جب یہ انقلابی دعوت سامنے آئے گی تو کشاکش شدید ہوگی‘ polarization بہت نمایاں ہوگی۔ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا‘ کچھ لوگ ہر چہ بادا باد کے انداز میں اس کو تسلیم کریں گے‘ قبول کریں گے‘ کچھ صریحاً اور کھلم کھلا مخالفت اور دشمنی پر اَڑ جائیں گے‘ جب کہ کچھ لوگ بیچ کے طبقات میں ہوں گے۔ چنانچہ مکی دور میں ایسا ہی ایک کردار سامنے آتا ہے۔ ایک کردار تو ابوجہل کا تھا‘ کھلم کھلا معاند‘ سامنے سے حملہ کرنے والا۔ ایک کردار ابولہب کا تھا‘ ہر خیر و خوبی سے خالی‘ جبکہ ایک کردار ولید بن مغیرہ کا تھا‘ جو مفاہمت اور مصالحت کا داعی تھا۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ غضب اس تیسرے کردار پر بھڑکا ہے۔ سورۃ القلم میں آیا ہے:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹﴾

''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا ڈھیلے پڑیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔''

اس کے بعد اس کردار کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳﴾

''اور آپؐ مت مانیے کسی ایسے شخص کی بات جو بہت قسمیں کھانے والا انتہائی گھٹیا ہے۔ رُو در رُو طعنے دیتا ہے‘ چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔ خیر سے روکنے والا‘ حد

سے بڑھنے والا‘ گنہگار۔ بالکل گنوار ہے‘ اس کے بعد یہ کہ بداصل بھی ہے۔‘‘

اس کی مذمت کے لیے بڑے ہی سخت (strong) الفاظ قرآن نے استعمال کیے ہیں‘ اور اس پر تقریباً اجماع ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کا مصالحانہ کردار ہے کہ کچھ دو‘ کچھ لو۔ اے محمد (ﷺ)! کچھ اپنی منوالو‘ کچھ اپنی قوم کی مان لو۔ اس تصادم اور فساد کا آخر کیا فائدہ ہے؟ ہر گھر میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ بھائی آپس میں لڑ گئے ہیں‘ اولاد اور والدین کے مابین جدائی ہوگئی ہے۔ بہرحال یہ تیسرا کردار مکہ میں بھی تھا۔ مصالحت‘ رواداری اور مفاہمت کے نام پر‘ کچھ give and take کے ذریعے سے آپس میں صلح کرنے کا انداز۔ اور یہی کردار پھر مدینہ کے اندر بھی آیا۔ اس میں یہود بھی تھے اور منافقین بھی۔ جیسے بڑے درختوں کے نیچے گھاس اور کچھ چھوٹے پودے اُگ آتے ہیں‘ اسی انداز میں مدینہ میں نفاق کی یہ فصل اُگی ہے۔ درحقیقت علماءِ یہود ہی کے زیرِ اثر‘ ان ہی کی undergroth کی حیثیت سے پروان چڑھی ہے۔

اب آیئے ہم ان آیات کے ایک ایک لفظ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۸﴾

لفظ النّاس کا ماخذ

یہاں مِنْ تبعیضیہ ہے‘ یعنی لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں... چونکہ یہاں ’’النّاس‘‘ کا لفظ پہلی مرتبہ آرہا ہے‘ تو اس کی بھی تھوڑی سی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اِنس اور انسان (اسم جمع: النَّاس) کے بارے میں تین آراء ہیں کہ اس کا اصل مادہ اور ماخذ کیا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ ’’نسیان‘‘ سے بنا ہے۔ نَسِیَ یَنْسٰی نِسْیَانًا: بھول جانا‘ فراموش کردینا۔ یہ رائے عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہے: سُمِّيَ اِنْسَانًا لِاَنَّهٗ عَهِدَ اِلَيْهِ فَنَسِيَ ۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ﴾ (آیت ۱۱۵) ’’اور اس سے پہلے ہم نے آدم سے ایک عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گیا۔‘‘ تو ’’نَسِیَ‘‘ سے ’’اِفعِلَان‘‘ کے وزن پر ’’اِنْسِیَان‘‘ اصل لفظ ہے جس کے درمیان میں سے

ایک ’’ی‘‘ حذف ہوگئی تو ’’اِنْسَان‘‘ بن گیا۔ چنانچہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے اِفْعِلان کے وزن پر۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اُنس سے بنا ہے‘ یعنی باہمی محبت وموانست‘ ایک دوسرے سے قرب وتعلق۔ اردو میں ’’اُنس‘‘ کا لفظ اور مفہوم معروف ہے۔ عربی میں اَنِسَ (س) وَ اَنُسَ (ک) اَنَسًا وَ اَنَسَةً وَ اَنَسَ (ض) اَنْسًا کا معنی مانوس ہونے کا ہے اور بِهٖ اور اِلَيْهِ کے ساتھ محبت کرنا‘ سکونِ قلب پانا کے معنوں میں آتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ انسان کے بارے میں مانا جاتا ہے کہ یہ مدنیُّ الطبع حیوان (greogorious animal) ہے۔ آپس میں مانوس ہوکر‘ مل جل کر رہنا اس کی طبیعت کا حصہ ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ یہ ’’آنَسَ‘‘ سے بنا ہے جو دیکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے طور کے ایک جانب آگ دیکھی ﴿اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ (القصص: ۲۹) تو اپنے گھروالوں سے کہا کہ تم ذرا یہاں انتظار کرو‘ میں جا کر دیکھتا ہوں۔ اس اعتبار سے انسان درحقیقت بمقابلہ جِنّ ہے۔ جِنّ کا مادّہ ج ن ن ہے جو مخفی شے کے لیے آتا ہے۔ وہ چونکہ غیر مرئی مخلوق ہیں‘ نظر نہیں آتے‘ اس لیے وہ جِنّ کہلاتے ہیں۔ انسان‘ انسان اس لیے کہلاتا ہے کہ وہ مرئی ہے‘ نظر آتا ہے‘ دیکھا جاسکتا ہے۔ تو یہ تیسری رائے ہے۔ اِنس کی جمع اَنَاسِیَّ ہے۔ سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ۴۹﴾ ’’اور بہت سے انسانوں کو‘‘۔ پھر اسی پر ’’ال‘‘ لگتا ہے تو ’’الاناس‘‘ کی بجائے ’’النّاس‘‘ استعمال ہوتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کو مانے بغیر ایمان معتبر نہیں!

﴿وَ مِنَ النَّاسِ﴾ ’’اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں‘‘ ﴿مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۸﴾ ’’جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر درآں حالیکہ وہ مؤمن نہیں ہیں‘‘۔ اٰمَنَّا: ’’ایمان رکھتے ہیں‘‘ کا یہ ترجمہ تاویل خاص کے اعتبار سے ہے۔ یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ اے مسلمانو! ہم تو

پہلے سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کی توحید کو‘ ہم پہلے سے ایمان رکھتے ہیں آخرت پر‘ بعث بعد الموت پر‘ لہٰذا ہمیں مؤمن مانو‘ ہم بھی مؤمن ہیں۔ محمد (ﷺ) پر ایمان لانا کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ بظاہر یہ دلیل بڑی منطقی معلوم ہوتی ہے کہ اصولی باتیں تو یہی دو ہیں‘ باقی تو ایک شخص معیّن کا معاملہ ہے‘ اسے مانا جائے یا نہ مانا جائے! اصولی اعتبار سے غور کیا جائے کہ ’’ایمانیاتِ ثلاثہ‘‘ میں سے اگر اللہ کو مان لیا جائے توحید کے ساتھ اور آخرت کو مان لیا جائے‘ قانونِ مکافات ومجازات کو تسلیم کرلیا جائے کہ اعمال کے نتائج نکلیں گے تو کیا ایمان کی تکمیل ہوگئی؟ درحقیقت اس آیتِ مبارکہ : ﴿..... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾﴾ (البقرۃ) میں یہی دو ایمان جمع کیے گئے ہیں۔ یعنی ایک اللہ پر ایمان‘ دوسرا اللہ کی طرف لوٹ جانے پر یقین۔ یہ دو چیزیں اصل ہیں۔ باقی رہا نبوت ورسالت کا معاملہ تو وہ بعض لوگوں کے نزدیک اشخاص کا معاملہ ہے جس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

مَیں اس بات کا تذکرہ خاص طور پر اس لیے کررہا ہوں کہ ہمارے ہاں ایک بہت بڑا تفسیری مسئلہ اور اشکال رہا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِـُٔوۡنَ وَالنَّصٰرٰی مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۹﴾﴾

’’بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے‘ اور وہ لوگ جو یہودی‘ صابی اور نصاریٰ (عیسائی) ہوئے‘ جو کوئی (ان میں سے) ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اُس نے اچھے عمل کیے تو اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے۔‘‘

یہی مضمون سورۃ البقرۃ‘ آیت ۶۲ میں بھی آیا ہے۔ وہاں پر بھی ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے کہ وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے ہیں۔ ان دو مقامات پر بہت سے لوگوں نے ڈیرا لگایا ہے کہ نجات کے لیے ایمان بالرسالت کی ضرورت نہیں۔ ان کا موقف ہے کہ ایمانیات میں سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ اور ان کا نتیجہ عملِ صالح‘ یہ دونوں چیزیں انسان کی نجات کے لیے کافی ہیں۔ اس فکر کے ڈانڈے ملتے ہیں یہود کے اس فکر کے ساتھ جو اس آیت میں آرہا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾﴾ ’’اور لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روزِ آخرت پر درآں حالیکہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔‘‘

اگر یہ آیت منافقین پر منطبق کی جائے تو ترجمہ ہوگا: ’’ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یومِ آخر پر درآں حالیکہ وہ ایمان نہیں لائے۔‘‘ لیکن اگر یہود کا قول پیشِ نظر رکھیں تو اس کی زیادہ مناسبت معلوم ہورہی ہے اس تاویلِ خاص کے ساتھ کہ یہود حضور ﷺ پر ایمان نہیں لارہے تھے لیکن مدّعی تھے کہ ہمیں بھی مؤمن مانو! اس لیے کہ جو اصل ایمان ہے یعنی اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان‘ اس میں ہم تمہارے ساتھ ہیں‘ ہمارے اور تمہارے مابین یہ قدرِ مشترک ہے۔ جبکہ حقیقتاً وہ مؤمن نہیں ہیں۔ بہرحال اس کا انطباق ان دونوں پر کیا جاسکتا ہے۔

آیت ۹ ﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ ’’وہ دھوکا دینے کی کوشش کررہے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو‘ اور نہیں دھوکا دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو‘ اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔‘‘

اللہ کو دھوکا دینا: چہ معنی دارد

خَدَعَ یَخۡدَعُ کا معنی ہے کسی کو دھوکا دینا‘ فریب دینا‘ چال بازی کرنا۔ حدیثِ نبویؐ ہے: ((اَلْحَرْبُ خَدْعَةٌ)) (متفق علیہ) ’’جنگ تو ایک چال ہے۔‘‘ بڑا حکیمانہ قول ہے کہ جنگ میں مکر اور حیلہ درست ہے۔ اس کے لیے بڑی پیاری مثال ہے: کجا می نمائی کجا می زنی! جب دوبدو جنگ ہوا کرتی تھی تو اس میں یہی سب سے بڑی چال ہوا کرتی تھی کہ آپ اپنے مقابل پر ظاہر کریں کہ اِدھر سے وار کررہا ہوں لیکن وار کسی اور طرف ہوجائے۔ یہ چال اور دھوکا درحقیقت جنگی حکمت عملی ہے۔ یُخٰدِعُوۡنَ بابِ مفاعلہ ہے‘ جس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دو فریق ایک دوسرے کے مقابلے میں ہوتے ہیں۔ جیسے مُقاتَلہ‘ یہ اُس کو قتل کرنا چاہتا ہے وہ اِس کو قتل کرنا چاہتا ہے‘ لیکن ضروری نہیں کہ قتل کرسکیں۔ لہٰذا ﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ کا ترجمہ مَیں نے کیا ہے: ’’یہ کوشش کرتے ہیں دھوکا دینے کی اللہ کو اور اہلِ ایمان کو۔‘‘

اللہ کو دھوکا دینا کس معنی میں ہے؟ یہ میرے لیے ایک لمحۂ فکریہ رہا ہے۔ظاہر بات ہے کوئی انسان بھی‘ چاہے وہ منافق ہو یا یہود میں سے ہو‘ یہ گمان تو نہیں کر سکتا کہ اللہ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رسول ﷺ کو دھوکا دینا درحقیقت اللہ کو دھوکا دینا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ﴾ (النساء:۸۰)

''جو اطاعت کرتا ہے رسول (ﷺ) کی اُسی نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔''

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾

''(اے نبی ﷺ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔'' (الفتح:۱۰)

بظاہر تو یہ دو ہی ہاتھ ہیں‘ ایک آپ ﷺ کا دستِ مبارک اور دوسرا آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے والے کا ہاتھ ہے‘ لیکن ایک تیسرا ہاتھ بھی ہے: ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ﴾۔ چنانچہ یہاں ﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ﴾ سے مراد میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم!

﴿وَمَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ﴾ ''اور نہیں دھوکا دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو۔'' اب یہاں ثلاثی مجرد سے آیا ہے خَدَعَ یَخۡدَعُ (دھوکا دینا) جیسے قَتَلَ یَقۡتُلُ (قتل کر دینا) حتمی اور یقینی بات کے لیے ہے‘ جبکہ مُخَادَعَۃ دھوکا دینے کی کوشش ہے۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ دھوکا دیں اللہ کو‘ اللہ کے رسول ﷺ کو اور اہلِ ایمان کو‘ اور نہیں دھوکا دے رہے مگر اپنے آپ کو۔ یہ خود دھوکے اور فریب میں آ گئے ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری چال ہمارے حق میں مفید ہو گی درآں حالیکہ یہ اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں‘ اپنے لیے کانٹے بو رہے ہیں‘ اپنی تباہی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ ''اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔'' شعور کا بنیادی مفہوم ہے کوئی ایسی چیز جو محسوس ہو۔ ایسی شے جس کا احساس حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل ہو جائے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس کے مفہوم میں غور‘ فکر‘ سوچ جیسی معنوی حقیقت کا

ادراک بھی شامل ہے۔ یہ لفظ اِن سب کا احاطہ کرتا ہے۔ ﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ ''انہیں اس کی سمجھ نہیں ہے''، یا ''وہ سمجھتے نہیں''، یا ''انہیں شعور نہیں''۔ شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''اور وہ نہیں سوچتے۔''

شعوری اور غیر شعوری نفاق

اس اعتبار سے مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اس ایک لفظ ''شعور'' کے حوالے سے نفاق کی اقسام یہیں واضح ہو جانی چاہئیں‘ اس لیے کہ ان آیات میں دو مرتبہ آیا ہے: ﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ اور ﴿وَلٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾۔ دراصل ایک رہا ہے شعوری نفاق‘ جان بوجھ کر نفاق‘ جس کی مثال سورۂ آلِ عمران میں آئی ہے:

﴿وَقَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡہَ النَّہَارِ وَاکۡفُرُوۡۤا اٰخِرَہٗ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۷۲﴾﴾

''اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے‘ اس پر ایمان لاؤ صبح کے وقت اور اس کا انکار کر دو دن کے آخر میں‘ شاید (اس تدبیر سے) ان میں سے بھی کچھ پھر جائیں۔''

یہ ایک سازش تھی۔ اہلِ کتاب میں سے یہود کے ایک گروہ نے یہ طے کیا کہ ایمان کی یہ جو ساکھ قائم ہو گئی ہے کہ جو ایک دفعہ محمد (ﷺ) کے دامن میں آ جائے‘ چاہے اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں وہ کسی طرح بھی اس تعلق کو توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا‘ اپنی ہر شے قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے‘ تو اس ساکھ کو توڑنے کی ایک شکل یہ ہے کہ صبح کے وقت ایمان کا اعلان کرو کہ ہم بھی قرآن پر اور محمد (ﷺ) پر ایمان لائے اور شام کو مرتد ہو جاؤ۔ (مَیں اس میں اضافہ کر رہا ہوں کہ وہ اپنا پورا دن حضور ﷺ کی صحبت میں گزارتے ہوں گے تاکہ لوگوں پر یہ اثر ڈال سکیں کہ ہم نے تو بہت قریب جا کر دیکھ لیا مگر دُور کے ڈھول سہانے ہیں۔ ہم تو ان پر ایمان لائے‘ ان کی محفل میں بیٹھے‘ انہیں قریب سے دیکھ لیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا‘ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے واپس آ گئے۔)

﴿لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ﴾ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی لوٹ آئیں۔ یعنی ان کے

دلوں میں کچھ نہ کچھ شبہ تو پیدا ہو جائے گا کہ بھئی! یہ بہت سمجھ دار اور بڑے ثقہ لوگ تھے‘ بڑے خلوص کے ساتھ آئے تھے۔ یہ دن بھر محمد ﷺ کی صحبت میں رہے‘ آخر کچھ نہ کچھ تو ضرور دیکھا ہوگا‘ یونہی تو انسان ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اس طرح ہم کچھ نہ کچھ شبہ تو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کا تجزیہ کیجیے کہ جن لوگوں نے اس سازش کے طور پر صبح ایمان لانے کا اور شام کو مرتد ہونے کا اعلان کیا تو انہوں نے جو بھی چند گھنٹے قانونی طور پر اسلام میں گزارے‘ لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ یہ ایمان لے آئے‘ لیکن خود اُن کو معلوم تھا کہ ہم یہ سب کچھ محض دھوکا دینے کے لیے کر رہے ہیں۔ گویا ایمان کی کوئی رمق کسی درجے ایک لمحے کے لیے بھی ان کے دل میں داخل تو کیا ہوتی‘ ان کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ اس لیے کہ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ یہ سازش ہے‘ یہ بہروپ ہے جو ہم بھر رہے ہیں‘ کسی درجے میں بھی ہم ایمان نہیں لائے۔ یہ ہے شعوری نفاق‘ جیسے کوئی ہندو جاسوس مسلمان کا روپ دھار کر آ جائے۔ اخبارات میں ایسی خبریں آتی رہی ہیں کہ کوئی ہندو جاسوس امام مسجد بن کر کسی سرحدی گاؤں میں امامت کراتا رہا‘ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو جاسوس تھا۔ ظاہر ہے جو اس کام کے لیے آئے گا وہ تو پوری طرح تیار ہو کر آئے گا۔ ختنہ کرا کر آئے گا‘ قرآن یاد کر کے‘ نماز سیکھ کر‘ داڑھی رکھ کر آئے گا‘ لیکن خود اسے تو اپنی حقیقت معلوم ہے۔ اسی طرح سازش کے طور پر ایمان کا اعلان کرنے والوں کو تو معلوم تھا کہ ہم ایمان نہیں لائے۔

یہ شعوری نفاق بہت کم اور بہت شاذ تھا۔ اکثر و بیشتر نفاق غیر شعوری تھا کہ لوگوں کو خود اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم منافق ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم ٹھیک ٹھاک مسلمان ہیں۔ ہم ایمان لائے ہیں‘ البتہ کیا ضروری ہے کہ ہر بات مانی جائے؟ کیا ضروری ہے کہ ہر مرحلے پر جب پکارا جائے تو ہم حاضر ہو جائیں؟ کیا ضروری ہے کہ محمد (ﷺ) کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے؟ سوچ سمجھ کر‘ دائیں بائیں دیکھ کر چلنا چاہیے‘ آگے پیچھے دیکھنا چاہیے‘ تحفظِ جان و مال بھی ضروری ہے۔ اس اعتبار سے مکی دور کے نفاق کی نوعیت قوتِ ارادی میں کمزوری کی تھی۔ پورے مکی قرآن میں صرف ایک سورۃ العنکبوت ہے جس

میں نفاق کا ذکر ہے اور وہ تذکرہ بھی آزمائشوں کے ذیل میں ہے۔ سورۃ العنکبوت کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کیجیے:

﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾﴾

”کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لائے اور اُنہیں آزمایا نہ جائے گا؟ (اُنہیں امتحان اور ابتلا کی کٹھالی میں سے گزرنا نہ پڑے گا؟) اور ہم نے تو اُن کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے (ایمان کے دعوے دار) تھے‘ پس اللہ تو ظاہر کر کے رہے گا اُن کو جو سچے ہیں (حقیقی مؤمن ہیں) اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں (جن کا ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے)۔“

اسی رکوع میں آگے چل کر جو الفاظ آتے ہیں ان کا اس مقام سے تقابل کر لیجیے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ ؕ اَوَ لَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ لَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر‘ مگر جب انہیں اللہ کی راہ میں ایذا پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی ایذا رسانی کو اللہ کے عذاب کی مانند سمجھ لیتے ہیں۔ اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ کے رب کی طرف سے مدد آ جائے تو یہ ضرور کہیں گے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہی تو تھے۔ تو کیا اللہ بخوبی واقف نہیں ہے اس سے جو جہان والوں کے سینوں میں مضمر ہے؟ اور یقیناً اللہ ظاہر کر کے رہے گا سچے اہلِ ایمان کو بھی اور ظاہر کر کے رہے گا منافقین کو بھی۔“

پورے مکی قرآن میں یہ واحد مقام ہے جہاں لفظ منافق آیا ہے۔ فرمایا کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ تو کر بیٹھتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر‘ لیکن جب اللہ کی راہ میں تکلیف آتی ہے‘ ایذا پہنچتی ہے‘ مصیبت آتی ہے‘ آزمائش کی بھٹی میں سے گزرنا

پڑتا ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش سے ایسے گھبرا اُٹھتے ہیں جیسے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ پسپائی اختیار کرتے ہیں‘ ان کے حوصلے جواب دے جاتے ہیں‘ اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ فرمایا: اگر تیرے رب کی مدد آ جائے‘ اگر سہولت کا وقت آ جائے تو یہی لوگ پھر آ کھڑے ہوں گے اور کہیں گے ہم بھی آپ کے ساتھ تھے‘ مالِ غنیمت میں سے ہمیں بھی کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف نہیں ہے جو لوگوں کے سینوں میں پنہاں ہے؟ اور اللہ تعالیٰ تو ظاہر کر دے گا اُن کو جو حقیقتاً مؤمن ہیں اور پردہ چاک کر دے گا ان کا بھی جو منافق ہیں۔

یہ مکی دور کا نفاق ہے جو یوں سمجھیے کہ ضعفِ ارادہ یعنی قوتِ ارادی کی کمی سے عبارت ہے۔ آدمی چلنا چاہتا ہے۔ ایک بات اچھی اور صحیح لگی ہے‘ دل گواہی دیتا ہے کہ حق ہے‘ چلو بھئی قبول کرلو‘ قبول کرلیا‘ لیکن پھر آزمائش آئی‘ رشتے ٹوٹ رہے ہیں‘ گھر سے نکالا جا رہا ہے‘ ماریں پڑ رہی ہیں تو اب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ عزیمت اور ہمت کی کمی ہے‘ قوتِ ارادی کا ضعف ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ چیز جس کا تذکرہ کیا گیا سورۃ العنکبوت میں۔

مدینہ منورہ میں آ کر اس میں ایک اور شے کا اضافہ ہوا کہ اب شعوری نفاق بھی شروع ہو گیا‘ جس کی مثال وہ سازشی نفاق ہے کہ محض دھوکا دینے کے لیے ایمان کا اعلان کیا جائے۔ مدینہ میں ایک اور چیز کا اضافہ بھی ہوا کہ اب قبائلی سطح پر فیصلے ہو رہے تھے۔ ایک گھرانہ طے کرتا ہے کہ ایمان لے آؤ! جیسے کہ مدنی دور کے آخر کا نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ﴿۲﴾﴾ (النصر) جب لوگ گروہ در گروہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو ظاہر بات ہے ہر شخص کے دل میں وہ یقین والا ایمان تو داخل نہیں ہو گیا تھا۔ ایک قبیلے کی سطح پر طے کیا گیا کہ چلو اب ایمان لے آؤ‘ اب مزاحمت جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب محمد (ﷺ) اور اہلِ ایمان کا راستہ نہیں روکا جا سکتا۔ اس وقت جو لوگ ایمان لاتے تھے ان میں یقیناً مؤمن صادق بھی تھے اور ان میں یقیناً منافق بھی ہوں گے کہ ٹھیک ہے اس وقت تو گردن جھکا لو‘ جب موقع آئے گا پھر دیکھیں گے۔ یہ گویا شعوری نفاق ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے کہ جنہوں نے کہا

بھئی ٹھیک ہے‘ بات تو صحیح ہے‘ دل گواہی دیتا ہے‘ فطرت کی بات ہے‘ ایمان لے آؤ! انفرادی سطح پر ایک سنجیدہ اور سوچا سمجھا فیصلہ اور شے ہوتی ہے‘ جب کہ اجتماعی فیصلہ‘ برادری اور قبیلے کی سطح پر فیصلہ‘ دوسری بات ہے۔ ظاہر ہے راستے میں جب تکالیف آئیں گی‘ مصائب آئیں گے تو پھر قدم ڈگمگائیں گے۔ تو یہ بھی نفاق کی ایک شکل تھی جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾﴾

’’یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے: تم ایمان نہیں لائے ہو‘ بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے (ہم نے اطاعت قبول کر لی) اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ لیکن اگر تم اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

اگر دھوکا تمہارے پیشِ نظر نہیں ہے‘ چاہے ایمان حقیقتاً دل میں داخل نہ بھی ہوا ہو‘ لیکن اطاعت کرو گے تو دل میں بھی ایمان داخل ہو جائے گا‘ اس لیے کہ عمل سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ البتہ یہ جان لو کہ حقیقی مؤمن کون ہے:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’حقیقی مؤمن تو وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول (ﷺ) پر‘ پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ صرف یہی ہیں سچے مؤمن۔‘‘

یہ ہیں درحقیقت نفاق کی مختلف صورتیں جو ﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ﴾ کے حوالے سے میں نے چاہا کہ یہیں پر واضح ہو جائیں۔ (جاری ہے) ❁❁

عظمتِ قرآن (۲)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاء

قرآن مجید کی حقانیت (authenticity) کا پہلو اور اس کے ذریعے تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہونا' ان دو حقائق کا اعتراف تو غیر مسلم بھی کرنے پر مجبور ہیں۔ ایچ جی ویلز نے انسانی تاریخ پر دو کتابیں لکھیں۔ The Concise History of the World میں اُس نے حضور ﷺ کی شخصیت پر تعددِ ازواج کے حوالے سے رکیک حملے کیے ہیں۔ دراصل اُن لوگوں کا آئیڈیل حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کی شخصیات ہیں جنہوں نے ایک شادی بھی نہیں کی' تجرد کی زندگی بسر کی۔ لہٰذا اس کے نزدیک شادی ایک گھٹیا فعل ہے' جبکہ رسول اللہ ﷺ نے گیارہ نکاح کیے۔ اس کے باوجود ایچ جی ویلز نے خطبہ حجۃ الوداع کے تاریخی جملے پورے کے پورے اپنی کتاب میں quote کیے:

> ''کسی عربی کو کسی عجمی پر' کسی عجمی کو کسی عربی پر' کسی گورے کو کسی کالے پر' کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں' سوائے تقویٰ کے۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔''

ان جملوں کا حوالہ دے کر وہ لکھتا ہے:

> *"Although the sermons of human freedom, fraternity and equality were said before, we find a lot of these sermons in Jesus of Nazareth, but it must beadmitted that it was Mohammad who for the first time in history established a society based on thesprinciples."*

> ''اگرچہ انسانی حریت' مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

اسی طرح گاندھی جی نے ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو صوبائی انتخابات کے بعد کانگریسی وزراء کو سادہ زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا: ''میں رام چندر اور کرشن جی کا حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے نام پیش کروں کیونکہ وہ عظیم الشان فرماں روا یعنی بہترین حکمران تھے مگر انہوں نے حکمرانی کے باوجود سادہ اور فقیرانہ زندگی بسر کی۔'' (ہفت روزہ ''ہریجن'') عربی میں کہا جاتا ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاء (اصل فضیلت وہ ہے جس کا دشمن اعتراف کرے)۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ مہاتما گاندھی اگر یہ اعتراف کر رہا ہے کہ حکومت کرنے کے اعتبار سے انسانی تاریخ کی عظیم شخصیات ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) ہیں تو یہ دونوں پھل درحقیقت شجرِ نبوت کے ہیں جن کی تربیت رسول اللہ ﷺ نے کی تھی۔ لہٰذا ہمیں ان اعتبارات سے قرآن مجید کے اعجاز کے پہلوؤں کی جانب خود بھی توجہ کرنی چاہیے اور دوسروں کو بھی متوجہ کرانا چاہیے۔

قرآن مجید کو کلامِ الٰہی ماننے والوں کو چاہیے کہ اس کی عظمت کے صحیح ادراک و شعور کے لیے قرآن مجید ہی پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی کیا مدح فرمائی ہے۔ فارسی کا ایک مصرعہ ہے ؏ ''قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری!'' یعنی ہیرے جواہرات کی قدر و قیمت کا اصل اندازہ یا تو بادشاہ کو ہوتا ہے یا پھر جوہری کو۔ عام آدمی ہیرے اور کانچ کے ٹکڑے میں فرق شاید ہی محسوس کر سکے۔ لہٰذا قرآن مجید کی عظمت کا صحیح ادراک یا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرامین کی رُو سے کیا جا سکتا ہے یا محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں۔ اسی لیے مَیں نے اپنے خطاب کے آغاز میں قرآن مجید کے تین

مقامات سے آیات پڑھی ہیں: سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات‘ سورۂ یونس کی دو آیات‘ سورۃ الحشر کی ایک آیت اور تین احادیثِ نبویہ ﷺ سنائی ہیں۔ اب ہم ان آیات اور احادیث کی تھوڑی سی تشریح سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں قرآن مجید کی عظمت کا نقش ہمارے قلوب واذہان پر قائم ہو سکے۔

کلام: متکلم کی ذات کا عکس

قرآن مجید ایک کلام ہے اور کسی بھی کلام کی عظمت متکلّم کی عظمت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کَلَامُ الْمُلُوْکِ مُلُوْکُ الْکَلَامِ یعنی بادشاہ کا کلام‘ کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ بادشاہ جب گفتگو کرے گا تو شاہانہ انداز سے کرے گا۔ کوئی بھکاری یا سبزی فروش جس طرح کلام کرے گا‘ اس کے دو جملے بولنے سے ہی اس کے علم‘ عقل‘ تہذیب اور تمدن کے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کلام دراصل متکلّم کی پوری شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کا مقام ومرتبہ‘ ذہن کی بلندی‘ فکر کی گہرائی‘ افقِ ذہنی کی وسعت کا اندازہ اس کے کلام سے ہو جاتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ صفاتِ الٰہی کا ایک کامل عکس قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس لطیف حقیقت کو سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ میں ایک تمثیل کے پیرائے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱﴾

’’اور اگر ہم اس قرآن کو نازل کر دیتے کسی پہاڑ پر تو یقیناً (اے نبی ﷺ) آپ دیکھتے اس کو کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔‘‘

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر میں اور آپ قرآن مجید کی عظمت سے واقف نہیں ہوں گے تو اِس کے لیے وقت کیسے لگائیں گے! آج کے انسان کا طرزِ عمل بڑا خود پسندانہ ہے۔ وہ کسی ایسے کام کے لیے ہی وقت لگاتا ہے جس میں اس کو فائدہ ہو‘ اور اگر فائدہ نہ نظر آرہا ہو تو اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں قرآن مجید کی عظمت کا ادراک ہو جائے تو ہم اپنا

پورا وقت اس کے لیے وقف کریں گے‘ اس کو سمجھیں گے‘ اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کریں گے۔ بقول علامہ اقبال: ع ’’قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!‘‘ اگر اس کی عظمت کا اِدراک نہیں ہوا تو بس یہ کہ اتفاقاً کبھی کھول لیا‘ پڑھ لیا‘ وہ بھی بغیر سمجھے اور اس کا ثواب کسی اور کو پہنچا دیا۔ آج تو یہ کلام حصولِ ثواب کے لیے بھی نہیں‘ بلکہ ایصالِ ثواب ہی کے لیے رہ گیا ہے۔ علامہ اقبال نے فارسی شعر میں اس کیفیت کی یوں ترجمانی کی ہے:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یاسینِ او آساں بمیری!

’’اے مسلمان! اس قرآن کی عظیم آیات سے آج تمہارا سروکار بس اتنا رہ گیا ہے کہ جب کوئی شخص حالتِ نزع میں ہو تو سورۂ یٰسٓ پڑھ لی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔‘‘

یہاں یہ مقصود نہیں کہ یٰسٓ پڑھی نہ جائے۔ حدیث میں ایسے موقع پر اسے پڑھنے کے لیے کہا گیا ہے‘ اس لیے ضرور پڑھنی چاہیے لیکن اس کا صرف یہی مصرف نہ رہ جائے۔ یہ تو انسانی زندگی کی رہنما کتاب بن کر نازل ہوئی ہے لیکن اس اعتبار سے اس جانب توجہ نہیں کی جا رہی۔ چنانچہ قرآن مجید نے اپنی عظمت کے بیان کے لیے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ میں یہ تمثیل بیان کی۔

مفسّرین اصول بیان کرتے ہیں: اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔ سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۴۳ میں یہ واقعہ آیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنے گئے تو درِ پردہ گفتگو ہوئی۔ ایسی صورت حال میں کہ آواز آرہی ہو لیکن سامنے والا نظر نہ آرہا ہو تو یقیناً دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ یہ پردہ ذرا سا ہٹ جائے اور دیدار کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا کئی بار شرفِ ہم کلامی حاصل ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ہمت وجرأت سے درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ﴾ ’’اے میرے ربّ! تُو مجھے یارائے نظر دے کہ مَیں تجھے دیکھ سکوں۔‘‘ اے پروردگار! میرے شوق واشتیاق کو

دیکھ کر مجھے دیدار بھی عطا فرما دے۔ جواب آیا: ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ ''تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔'' تم اس جسد ظاہری سے میرا دیدار نہیں کر سکتے ہو۔ ہم تم کو ایک مثال دیتے ہیں: ﴿وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ﴾ ''لیکن تم ذرا اُس پہاڑ کی طرف دیکھو۔'' ہم اپنی ایک تجلی اس پر ڈالیں گے۔ ﴿فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ﴾ ''پھر اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تم مجھے دیکھ لو گے۔'' یعنی اگر پہاڑ ہماری تجلی کا متحمل ہو گیا تو تم بھی سوچنا کہ شاید ہمیں دیکھ سکو۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا﴾ ''تو جب اس کے ربّ نے اپنی تجلّی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پھٹ گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔'' ابھی تجلّی براہِ راست موسیٰ پر نہیں پڑی تھی۔ یہ تجلیٔ ربانی کا بالواسطہ مشاہدہ تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جو تاثیر ذاتِ ربانی کی تجلّی کی ہے‘ وہی تاثیر کلامِ ربانی کی ہے بشرطیکہ ہمیں اس کا ادراک وشعور ہو اور ہمارے دل اُس استعداد اور صلاحیت کو اپنے اندر پیدا کریں۔ اس کو بھی علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

''(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اُسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!''

عالمی انقلاب کا پیش خیمہ

اللہ تعالیٰ کی کُل صفاتِ ربانیہ‘ ظاہر و باطن کی جتنی بھی صفات ہیں‘ وہی صفات اس کلام کی ہیں۔ اِس دور میں عظمتِ قرآنی کا سب سے زیادہ شعور رکھنے والے علامہ اقبال ہیں۔ قرآن مجید کی عظمت کے بارے میں ایسے الفاظ کہیں اور نہیں مل سکتے۔ وہ یہ بھی

فرماتے ہیں:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شدُ جہاں دیگر شود

''(یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے‘ اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اُس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے!''

اور پھر اندر کا یہی انقلاب ہی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ جو انقلاب باہر سے ٹھونسا گیا ہو‘ وہ خارجی دباؤ ختم ہونے کی صورت میں باقی نہیں رہتا۔ انسانی شخصیتوں میں جب اندر سے تبدیلی ابھرتی ہے تب ہی انسان کا پورا وجود بدلتا ہے‘ اور پھر وہ عالمی انقلاب کا سبب بنتا ہے‘ جیسا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے انقلاب کی صورت میں ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہودی عبداللہ بن سبا کی سازش کی کامیابی کی وجہ سے ہی مسلمانوں کا باہمی اختلاف ہوا۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت‘ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کے درمیان جنگِ جمل‘ جنگ صِفّین‘ جنگِ نہروان ہوئیں۔ اگر یہ سب نہ ہوتا تو جس رفتار سے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی توسیع ہو رہی تھی‘ دنیا کی کوئی طاقت اسے روکنے والی نہ تھی۔ علامہ اقبال نے اس کا بھی نقشہ یوں کھینچا: ع ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!''

حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اندرونی انقلاب برپا کیا۔ اس اندرونی انقلاب نے پورے عرب میں انقلاب کی شکل اختیار کی۔ اس انقلاب میں اس قدر قوت تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بیس برس کے اندر ایک عظیم اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی۔ ایسا تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ معاملہ اگر چلتا رہتا تو اس کو روکنے والی کوئی طاقت نہیں تھی کیونکہ سلطنتِ روما اور سلطنتِ کسریٰ ختم ہو چکی تھیں۔ درحقیقت یہودی سازش نے مسلمانوں کو اندر سے سبوتاژ کیا۔ بہرحال‘ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اصل طریقہ اندرونی تبدیلی تھا‘ جیسے علامہ اقبال نے کہا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؒ نہ صاحبِ کشاف

یعنی قرآن مجید کے حوالہ سے یہ محسوس کرو کہ جیسے یہ تمہارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ''قرآن کے بعض پڑھنے والے ایسے ہیں کہ جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے مصحف پر لکھا ہوا نہیں بلکہ ان کے اپنے دل پر کندہ ہے۔'' قرآن مجید اور انسانی فطرت میں اتنی کامل مطابقت ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے یہ کتاب ان صفحات پر نہیں بلکہ لوحِ قلب پر لکھی ہے جہاں سے انسان اُسے پڑھ رہا ہے۔ عظمتِ قرآن کے اس پہلو کا شعور ہر ایک کے لیے ممکن نہیں' بلکہ وہی شخص جس کا باطن بیدار ہو چکا ہو' جس کی روح بیدار ہو چکی ہو' وہ قرآن مجید کی اس تاثیر کو محسوس کرے گا۔

تمام نوعِ انسانی کے لیے افادیت

کسی کلام کی عظمت کا دوسرا پہلو نوعِ انسانی کے لیے اس کی افادیت کے اعتبار سے ہو سکتا ہے۔ یہ مقام سورۂ یونس کا ہے جس کی دو آیات عظمتِ قرآن کا عظیم خزانہ ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس آ چکی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور شفا ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں اور مؤمنوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے' پس چاہیے کہ وہ اس پر خوشیاں منائیں۔ یہ ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

یہاں پر چار اہم الفاظ آئے ہیں: موعظہ' شفا' ہدایت اور رحمت۔ ان کی ترتیب پر غور کریں۔ پہلا لفظ مَوۡعِظَة (یعنی نصیحت) وعظ سے نکلا ہے۔ وہ بات جس سے دل نرم ہو جائے' دل کے اندر گداز پیدا کرنے والی شے۔ آج ہم نے قرآن مجید کو محض ایک مقدس

کتاب سمجھ لیا ہے' حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کا آلہ۔ دراصل اعلیٰ سے اعلیٰ حکیمانہ بات بھی سخت دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کے اوپر ایک غلاف (crust) آ جاتا ہے' جیسا کہ یہود کے علماء کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾﴾

''اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل تو غلافوں میں بند ہیں' بلکہ (حقیقت میں تو) اُن پر لعنت ہو چکی ہے اللہ کی طرف سے اُن کے کفر کی وجہ سے' پس اب کم ہی (ہوں گے ان میں سے جو) ایمان لائیں گے۔''

مزید ارشاد ہوا:

﴿ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۷۴)

''پھر اس سب کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اُن سے بھی زیادہ سخت۔ اور پتھروں میں تو وہ بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں' اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور اُن سے پانی بہ نکلتا ہے' اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔''

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کا دل سخت ہو جائے تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو سکتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی شے اس کی سختی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چٹیل زمین کی سختی کو پہلے نرم کرنا ہوگا' اُس زمین پر ہل چلے گا تو بارش فائدہ دے گی' ورنہ چٹیل زمین پر تو پانی بہ جائے گا' زمین میں جذب نہیں ہوگا۔ چنانچہ پہلا لفظ استعمال کیا گیا موعظہ۔ قرآن مجید وعظ ہے' نصیحت ہے' دلوں کو نرم کرتا ہے۔ دلوں پر جو سخت تہ جم جاتی ہے اسے توڑتا ہے' اس پر ہل چلاتا ہے۔ پھر جب یہ جذب ہو جاتا ہے تو سینوں کے اندر موجود امراض کے لیے شفا ہے۔

علامہ اقبال نے ان ہی دو اعتبارات سے اُمّتِ مُسلمہ کی حالت پر مرثیہ کہا کہ

مسلمانوں نے اس قرآن مجید کو نہ موعظہ کے لیے استعمال کیا اور نہ تزکیۂ نفس کے لیے‘ بلکہ اسے صرف جان آسانی سے نکالنے کا نسخہ بنا لیا‘ یا پھر ایصالِ ثواب کا آلہ۔ ان کے فارسی اشعار ہیں:

واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند　　　معنیٔ او پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو　　　با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

’’واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادیؒ سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمیؒ سے‘ اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف‘ شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!‘‘

وہ بخاری‘ مسلم اور ترمذی کی روایات پیش نہیں کر رہے۔ ضعیف‘ شاذ‘ مرسل روایات بیان کر رہے ہیں جن کی سند حضور ﷺ سے متصل نہیں۔ سب سے بڑا موعظہ تو قرآن مجید ہے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ (ق:۴۵) ’’(اے نبی ﷺ!) آپ اس قرآن کے ذریعے نصیحت کیجیے۔‘‘ یہ قرآن ہی دل کی سختی ختم کرے گا‘ گداز پیدا کرے گا۔ پھر علامہ اقبال کہتے ہیں:

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست　　　از شرابِ نغمۂ قوال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش　　　در نمی سازد بقرآں محفلش

’’اونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے! اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!‘‘

صوفیاءِ حق کے علاوہ تصوف کے جو معروف حلقے ہیں وہاں قوالی پر مستی و حال آتا ہے۔ اس سے کیف و سرور تو حاصل ہو رہا ہے مگر ان کی محفل میں قرآن مجید کا کہیں ذکر نہیں جب کہ حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمائش کر کے قرآن مجید سنا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((اِقْرَأْ عَلَيَّ)) ’’مجھے قرآن سناؤ!‘‘ مَیں نے عرض کیا: ’’آپؐ کو سناؤں؟ آپؐ پر تو نازل ہوا ہے۔‘‘ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں! مجھے کسی اور سے سن کر کچھ اور لطف حاصل ہوتا ہے۔‘‘ اب چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محفل میں تشریف فرما ہیں۔ سب ادب سے ایسے ساکت و صامت بیٹھے ہیں جیسے ان کے سروں پر پرندے ہوں کہ ذرا سی جنبش کریں گے تو وہ اُڑ جائیں گے۔ ایسی محفل میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾﴾

’’پس اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت پر ایک گواہ لے کر آئیں گے اور (اے نبی ﷺ) آپ کو ان کے خلاف گواہ بنا کر لائیں گے۔‘‘

تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((حَسْبُکَ الْآنَ)) ’’اب بس کرو!‘‘ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ (متفق علیہ)

یہ اُس مسنون محفل سماع کا نقشہ ہے۔ کاش کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے! قرآن مجید کے اندر یقیناً گداز ہے۔ جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ (آیت ۸۲)

’’اور جب انہوں نے سنا وہ (کلام) جو نازل کیا گیا رسول (ﷺ) کی طرف تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ وہ بہ نکلیں آنسوؤں سے اس وجہ سے جو انہوں نے پہچان لیا حق میں سے۔‘‘

دوسری چیز یہ ہے کہ سینوں میں جو روگ ہیں ان کا علاج یعنی تزکیۂ نفس کا ذریعہ درحقیقت قرآن مجید ہے۔ حُبِ دنیا‘ حُبِ مال‘ حُبِ شہرت‘ حُبِ اقتدار (urge to dominate) یہ انسان کے جبلی تقاضے ہیں جن کی وجہ سے فساد رونما ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اَلۡهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝۲﴾ ''کثرت اور بہتات کی طلب تمہیں غافل کیے رکھتی ہے' یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچتے ہو۔'' جس کے پاس دس دس نسلوں کے لیے کھانے کو موجود ہے' اس کی بھی مزید کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ دل کے اِن روگوں اور سینے کے امراض کا علاج قرآن مجید ہی ہے۔

تیسرا لفظ هُدًى (ہدایت) ہے۔ دراصل جب پہلی دونوں چیزیں ہوں گی تو ہی ہدایت کی افادیت ہے۔ جب تک دل میں گداز اور نرمی نہ ہو' ہدایت بے کار ہے۔ ہدایت مؤثر نہیں ہے جب تک نیت درست نہ ہو۔ کوئی شخص بڑا عالم ہو لیکن اپنے علم کو دنیا بنانے کا ذریعہ بنالے تو قرآن مجید روزِ قیامت اس کے حق میں ہدایت کا ذریعہ نہیں بلکہ عذابِ الٰہی کا سبب بنے گا۔ رسول ﷺ نے فرمایا: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) (صحیح مسلم: ۵۳۴) ''قرآن یا تمہارے حق میں حجّت ہوگا یا تمہارے خلاف۔'' اگر کوئی شخص قرآن مجید کو شہرت کے حصول کا' یا دنیا کمانے کا' یا اپنی تعریف کا ذریعہ بنا رہا ہو تو اس حوالہ سے حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں سب سے پہلے ان لوگوں کا معاملہ پیش ہوگا جن میں ایک عالم' ایک سخی اور ایک شہید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ باری باری اُن تینوں سے اپنی نعمتوں کا ذکر کر کے پوچھے گا کہ تم کیا کر کے آئے! اس پر وہ تینوں اپنا معاملہ بیان کریں گے' لیکن ان کو جواب ملے گا کہ تم نے جو کچھ کیا' دنیا والوں کو دکھانے کے لیے کیا اور تمہارا نام دنیا میں ہوگیا' لہٰذا یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں۔ پھر فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان تینوں کو اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں۔ (صحیح مسلم) اَللّٰھُمَّ أَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ!

لہٰذا جان لیجیے کہ جب تک دل کے روگ درست نہ ہوں' علم بے کار ہے' ہدایت قطعاً غیر مفید ہے۔ پہلے دل کے اوپر سے جمی ہوئی پپڑی (crust) اُترے' اس کی سختی دور ہو تو اس کا ذریعہ ہے مَوْعِظَة۔ جب دل کے اندر سے حُبِّ جاہ' حُبِّ مال' حبِ دُنیا نکلے' تو یہ ہے تزکیہ یعنی شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ اس کے بعد ہی ہدایتِ خداوندی کے تحت آپ راستہ دیکھ سکیں گے' اُس پر چلیں گے۔ یہ ہدایت آخرت میں رحمت کی شکل میں ظاہر

ہوگی۔ جنہوں نے قرآن مجید کی ہدایت سے دنیا میں فائدہ اٹھایا' آخرت میں رحمتِ الٰہی کی بدلیاں اُن پر سایہ کریں گی۔ جیسا کہ حدیثِ مبارکہ ہے کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آلِ عمران دو بدلیوں کی صورت میں میدانِ حشر میں ظاہر ہوں گی اور ان لوگوں پر سایہ کریں گی جن کو ان سے بڑی محبت تھی۔

بہرحال اس آیت میں آنے والے چار الفاظ کی ترتیب پر غور کریں:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۵۷﴾

یعنی وعظ' شفا' ہدایت اور پھر رحمت۔ یہ الفاظ عملی اعتبار سے بہت افادیت رکھتے ہیں۔

اگلی آیت کے الفاظ بھی بہت اہم ہیں:

﴿قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ۝۵۸﴾

''کہہ دیجیے کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے' سو چاہیے کہ وہ اس پر خوشیاں منائیں۔ یہ بہتر ہے اُن سب سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

قرآن مجید کی شکل میں ہم پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بہت بڑی رحمت کا ظہور ہوا ہے۔ اُس کی رحمت کا مظہرِ اَتم قرآن مجید ہے۔ اُس کے فضل کا سب سے بڑا ثبوت قرآن مجید کی صورت میں ہمیں ملا ہے۔ ﴿فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا﴾ اِس پر لوگوں کو خوشیاں منانی چاہئیں کہ قرآن مجید کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قدر عظیم دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اتنا بڑا احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر کیا ہے۔ ﴿هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ۝۵۸﴾ جو چیزیں یہ لوگ جمع کرنے کی فکر کر رہے ہیں' اُن سے کہیں زیادہ قیمتی یہ قرآن مجید ہے۔ کاش کہ یہ دو آیات ہی ہمارے قلب کے اوپر کندہ ہو جائیں!

صوتی ولفظی حسن

تیسرا مقام سورۃ الرحمٰن کا ہے جس کی بہت چھوٹی چھوٹی آیات ہیں۔ حدیثِ نبویؐ میں سورۃ الرحمٰن کو ''عُرُوْسُ الْقرآن'' (قرآن کی دلہن) قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح دلہن کو خوش نما لباس سے سجایا جاتا ہے' زیور اور زیب وزینت سے آراستہ کیا جاتا ہے اسی

طرح سورۃ الرحمٰن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے آراستہ کیا ہے۔ اس کا اپنا ایک ملکوتی غناء (Divine Music) ہے۔ اللہ تعالیٰ مصر کے حضرات شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور شیخ محمود خلیل الحصری جیسے قُرّاء پر رحمتیں نازل فرمائے جنہوں نے قرآن مجید کے اِس غناء کو واضح کیا ہے۔ قرآن مجید کے لیے غناء (موسیقی) کا لفظ خدانخواستہ اس کی توہین نہیں بلکہ حدیثِ مبارکہ میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کو خوش الحانی سے‘ اچھی سے اچھی آواز سے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)) (صحیح البخاری: ۷۵۲۷) ’’جو قرآن مجید کو اچھی آواز سے (بہتر سے بہتر انداز میں) نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔‘‘

ایک مرتبہ رات کے وقت رسول اللہﷺ کا حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کے گھر کے پاس سے گزر ہوا تو وہ تہجد کے وقت کھڑے کیف کے عالم میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضورﷺ کو ان کی قراءت بہت پسند آئی‘ کافی دیر تک وہاں کھڑے سنتے رہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ کون سن رہا ہے۔ صبح فجر میں جب حضورﷺ کی ان سے ملاقات ہوئی تو آپؐ نے تحسین کے انداز میں فرمایا:

((يَا اَبَا مُوْسٰى! لَقَدْ اُوْتِيْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوٗدَ))

(صحیح البخاری: ۵۰۴۸)

’’اے ابوموسیٰ! تمہیں تو آلِ داوٗد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا فرمایا گیا ہے۔‘‘

لحنِ داؤدی مشہور ہے کہ جب حضرت داوٗد علیہ السلام حمد کے ترانے الاپتے تھے تو قرآن مجید میں آتا ہے کہ ان کے ساتھ پرندے شامل ہو جاتے تھے اور پہاڑ وجد میں آکر ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس طرح کان لگا کر خوش الحانی سے بآوازِ بلند پڑھے جانے والے قرآن مجید کو سنتے ہیں‘ اس طرح کسی دوسری شے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں تو سب سے زیادہ متوجہ ہو کر سننے والا خود اللہ ہوتا ہے۔

بہرحال قرآن مجید کا حسنِ معنوی تو ہر ہر لفظ میں موجود ہے لیکن اس کا حسنِ ظاہری یعنی حسنِ صوتی وحسنِ لفظی دراصل سورۃ الرحمٰن میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔

سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں چار عظیم حقائق

یہ سورت ابتدائی چار آیات کے حوالہ سے بھی بہت ممتاز ہے۔ ان آیات پر توجہ کی جائے تو عظیم حقائق سامنے آتے ہیں۔ پہلی چار آیات میں چوٹی کی چار چیزوں کا ذکر ہے۔ پہلی آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ ①﴾ ہے جو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ہے۔ اس کا مادہ رحمت سے ہے۔ انسان سب سے زیادہ رحمتِ خداوندی کا محتاج ہے‘ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا:

((مَا مِنْ اَحَدٍ يُدْخِلُهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) فَقِيْلَ : وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((وَلَا اَنَا، اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِي رَبِّيْ بِرَحْمَةٍ)) (متفق علیه)

’’تم میں سے کسی شخص کو اُس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔‘‘ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! آپؐ کو بھی نہیں؟ آپﷺ نے فرمایا: ’’ہاں مجھے بھی نہیں‘ مگر یہ کہ میرا ربّ مجھے اپنی رحمت میں چھپا لے۔‘‘

جب محمد رسول اللہﷺ رحمتِ الٰہی کے اس قدر محتاج ہیں تو ہماری کیا حیثیت! قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کی شان کو رحمٰن اور رحیم سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسم ’’الرَّحِيْم‘‘ اللہ تعالیٰ کی دائمی اور مستقل رحمت کا مظہر ہے‘ جبکہ ’’الرَّحْمٰن‘‘ دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وہ شان ہے جس میں ہیجان کی کیفیت ہو‘ جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر‘ گویا رحمٰن سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کا طوفانی جوش ہے۔

اگلی آیت ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ②﴾ ’’اُس نے قرآن سکھایا۔‘‘ رحمٰن کی رحمانیت کا سب سے بڑا مظہر قرآن مجید ہے۔ جو علم بھی انسان کو حاصل ہوا‘ وہ اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ’’اور سکھائے آدم کو ساری چیزوں کے نام۔‘‘ حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم اَسماء دیا گیا اسی کا ظہور سائنس اور دوسرے تمام علوم ہیں۔ یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے دیے ہوئے ہیں لیکن جیسے

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام ’’الرحمٰن‘‘ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ سکھایا‘ اس میں سے چوٹی کا علم ’’قرآن‘‘ ہے۔

پھر فرمایا: ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۳﴾ ’’(اللہ نے) انسان کو پیدا کیا۔‘‘ غور کریں تو آسمان‘ زمین‘ فرشتے‘ حیوانات اور دیگر تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ البتہ اُس کی تخلیق کا نقطۂ عروج ’’انسان‘‘ ہے جس کو مسجودِ ملائک بنایا گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِي الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا ۷۰﴾

’’اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی‘ اور ان کو خشکی اور سمندر میں سواریاں عطا کیں‘ اور ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا‘ اور انہیں فضیلت عطا کی اپنی بہت سی مخلوقات پر۔‘‘

اب چوتھی چیز: ﴿عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ۴﴾ ’’انسان کو بیان کی صلاحیت عطا فرمائی۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بینائی‘ سماعت اور کئی حواس اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں لیکن ان میں سب سے اونچی ’’بیان‘‘ کی صلاحیت ہے۔ اسی لیے انسان کو ’’حیوانِ ناطق‘‘ قرار دیا جاتا ہے‘ یعنی گویائی کی صلاحیت ہی کی وجہ سے انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔ پس ہم نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں چوٹی کا نام الرحمٰن‘ اُس نے جو علوم عطا کیے ان میں چوٹی کا علم قرآن مجید‘ تمام مخلوقات میں چوٹی کی مخلوق انسان اور انسان کو عطا کردہ صلاحیتوں میں چوٹی کی اِستعداد بیان۔ ان سب کو جمع کرنے سے نتیجہ ایک حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی شکل میں سامنے آتا ہے‘ جس کے راوی حضرت عثمان بن عفان ؓ ہیں۔ حسنِ اتفاق کہہ لیجیے کہ یہ تمام الفاظ ہم قافیہ بھی ہیں: رحمٰن‘ قرآن‘ انسان‘ بیان‘ عثمان‘ عفان۔

عَنْ عثمان بن عفان رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) (صحیح البخاری:۵۰۲۷)

حضرت عثمان (ذوالنورین) ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔‘‘

یہاں پر خیر کا لفظ مِنۡ کے بغیر آیا ہے تو یہ superlative degree ہے۔ خَیۡرُکُمۡ: The best amongst you یعنی تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ جو قرآن پڑھیں اور اُسے بیان کریں۔

انسان کی قوتِ بیان کا بہترین استعمال

قوتِ بیان انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیت ہے‘ لہٰذا اس کا استعمال بھی اعلیٰ ترین ہونا چاہیے۔ اردو کا محاورہ ہے کہ توپ سے مکھی نہیں ماری جاتی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے تو اسے قرآن مجید کو بیان کرنے کے لیے لگاؤ۔ علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے:

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را!

یعنی اگر تمہارے اندر خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے اور مٹھی بھر پَر اللہ نے دیے ہیں تو میرے پاس آؤ کہ میں تمہیں شہبازی کے طریقے سکھاؤں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں حیوانِ ناطق بنایا ہے‘ تکلم کی صلاحیت دی ہے تو اس صلاحیت کا مصرف محض دنیا حاصل کرنے کو نہ بناؤ بلکہ اللہ کے کلام کو پھیلانے کا ذریعہ بناؤ۔

آج سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کو موجودہ حالات کے تناظر میں پڑھا جائے۔ قرآن مجید اُترا تو چودہ سو برس پہلے ہے مگر نوعِ انسانی کو تا قیامِ قیامت جتنے بھی مسائل درپیش ہوں گے‘ ان سب کا حل قرآن مجید میں موجود ہے۔ البتہ اس کے لیے قرآن مجید کی گہرائیوں میں اُترنا ہوگا اور اس میں سے موجودہ دور کے لیے رہنمائی اخذ کر کے آج کے انسان تک پہنچانا ہی اُمّتِ مُسلمہ کا اصل فریضہ ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((بَلِّغُوْا عَنِّی وَ لَوْ آیَةً)) (صحیح البخاری:۳۴۶۱) ’’پہنچاؤ میری طرف سے چاہے ایک ہی آیت۔‘‘ پھر رسول اللہ ﷺ نے اسی موقع پر

سوا لاکھ مسلمانوں کے مجمع سے گواہی لی تھی: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ”کیا میں نے پہنچا دیا؟“ پورے مجمع کی طرف سے جواب آیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ، وَ اَدَّیْتَ الْاَمَانَةَ، وَ نَصَحْتَ الْاُمَّةَ، وَ کَشَفْتَ الْغُمَّةَ ”ہاں ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کے فرائض کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے امانت ادا کرنے کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے اُمّت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور آپؐ نے گمراہی کے اندھیروں کو چاک کر دیا۔“ تین مرتبہ آپ ﷺ نے سوال کیا اور تین بار آپ کو جواب ملا۔ پھر آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور اپنی شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر کے تین بار فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ”اے اللہ! تُو گواہ رہنا۔“ اس طرح آپؐ نے گواہی لے کر اطمینان کا سانس (sigh of relief) لیا کہ ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۝۵﴾ (المزّمل) کا مصداق ایک بھاری بوجھ آپؐ کے کندھوں سے اُتر گیا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو حکم ہوا تھا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۷)

”اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا۔“

حضور ﷺ نے یہ پیغام پہنچانے کی گواہی لے کر اطمینان کا سانس لیا اور پھر چھوٹا سا ایک جملہ فرمایا جو ہمیں یاد کر لینا چاہیے: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) (صحیح البخاری:۷۰۷۸) ”پس پہنچائے وہ جو یہاں موجود ہے اُس کو جو یہاں موجود نہیں۔“ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے ہے۔ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

ہند کے لوگوں تک‘ چین کے گھروں تک‘ یورپ کے کلیساؤں تک‘ افریقہ کے تپتے صحراؤں تک اس پیغام کو پہنچانا اب اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ذمہ داری ہے۔ آپ ﷺ

نے مزید تاکیداً فرمایا: ((بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً)) ”پہنچاؤ میری طرف سے چاہے ایک ہی آیت۔“ گویا کوئی بھی اُمّتی اس فرض سے بالکل محروم نہ رہے۔ ایک آیت بھی پہنچا سکتا ہو تو پہنچائے۔ یہ ہے وہ ذمہ داری جو اس حدیث کی رُو سے تشویق وترغیب کے انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی بہترین کیریئر‘ اعلیٰ زندگی‘ اور اپنے وقت کو قیمتی بنانا چاہتا ہے تو قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے میں لگ جائے۔ کاش کہ ہم سمجھ سکیں کہ قرآن مجید کو سیکھنا اور سکھانا اعلیٰ ترین کیریئر ہے اور قرآن مجید کی تبلیغ و دعوت میں گزرنے والا ہر لمحہ کس قدر قیمتی اور باعثِ اجر ہے!

اُمّتِ مُسلمہ کے عروج وزوال کی بنیاد

دوسری حدیث مبارکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))

(صحیح مسلم:۱۸۹۷)

”بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کچھ قوموں کو اُٹھائے گا اور اس کو ترک کرنے کے باعث دوسروں کو رسوا کر دے گا۔“

یہ ابدالآباد تک مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اس کتاب کو لے کر اٹھیں گے تو سربلند ہوں گے اور اس کتاب کو پیٹھ دکھائیں گے تو ذلیل کر دیے جائیں گے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے عروج وزوال کا انحصار اسی کتاب پر ہے۔ ”جوابِ شکوہ“ میں علامہ اقبال نے اس کیفیت کو سادہ ترین الفاظ میں کہا ہے: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

یہی بات اقبال نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور دردانگیز پیرائے میں یوں بیان کی ہے:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی!

اے جو شبنم بر زمیں افتندہٗ — در بغل داری کتابِ زندہٗ

’’(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تُو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے‘ لیکن تُو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے) اُٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تُو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)‘‘

آج رسولِ اکرم ﷺ کی اُمّت دُنیا کی قوموں کے سامنے پامال و سرنگوں ہے‘ لیکن اگر یہ ہوش میں آجائے تو اس کتابِ زندہ کی بدولت ان کی امام بن سکتی ہے۔ وہ عرب کی سرزمین جہاں تہذیب و تمدن نہیں تھا‘ اندھیرے و تاریکیاں تھیں‘ وہاں کے باسی اسی کتاب کی بدولت دنیا کے امام بن گئے۔ یہی کتاب تھی جس نے انہیں نئے نئے علوم ایجاد کرنا سکھائے۔ اس کتاب کی بدولت عرب نے یونان کے فلسفہ اور سائنس کو زندہ کیا اور سپین کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے یورپ تک دوبارہ پہنچا دیا۔ جب مسلمان ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تو پوری دنیا پر چھا گئے۔ دراصل تلوار کا ذکر معذرت خواہانہ انداز میں نہیں کرنا چاہیے۔ انقلاب کی تکمیل تلوار سے ہوتی ہے مگر تمہید قرآن مجید بنتا ہے۔ انقلاب صرف کتاب سے کبھی نہیں آیا۔ کتاب سے سوچ و فکر بدلتی ہے‘ جماعت کی قوت تیار ہوتی ہے لیکن اس سے ہرگز بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل میں یقیناً تلوار کا بھی حصہ ہے۔ میدانِ بدر میں جو تین سو تیرہ نفوس موجود تھے‘ وہ یقیناً قرآن مجید کے اعجاز کا ظہور تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ﴾ کے طریقہ کار کے مطابق اعلیٰ تربیت یافتہ لوگ تیار کیے تھے لیکن انقلاب کی عملی تکمیل کے لیے وہ بھی ہاتھ میں تلوار لے کر اٹھے۔

صحابہ کرام ﷡ کے تزکیۂ نفس کا سارا عمل تیرہ برس تک قرآن مجید کے ذریعے ہوا تھا اور جب ایک تربیت یافتہ جماعت کی صورت میں قوت وجود میں آ گئی تو پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں باطل نظام سے ٹکرا گئے۔ تبھی عرب کی سرزمین پر اسلامی انقلاب

رونما ہوا: ﴿وَ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَہَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’اور آپؐ کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی بھاگ جانے والا۔‘‘ بہرحال اللہ تعالیٰ نے مسلمان اقوام کے لیے اب اس کتاب کو میزان بنا دیا ہے: ﴿وَ بِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰہُ وَ بِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۵) ’’اور ہم نے اسے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق کے ساتھ ہی یہ نازل ہوا ہے۔‘‘ ﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿۱۴﴾﴾ (الطارق) ’’بے شک یہ فیصلہ کن کلام ہے‘ اور کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔‘‘ اس کتاب کو پیٹھ دکھانے ہی کی وجہ سے مسلمان تقریباً تین سو برس سے پوری دنیا میں زوال کا شکار ہیں۔

ایک حدیث جس کے راوی حضرت ابوبکر صِدّیق ﷜ ہیں‘ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی دولت عطا کی ہو اور پھر بھی اُس کے دل میں یہ خیال آئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی اور بندے کو زیادہ بڑی نعمت دی ہے‘ اُس نے گویا قرآن کی ناقدری کی۔ کسی بہت دولت مند شخص کو دیکھ کر‘ کسی کا بہت بڑا محل دیکھ کر اگر کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ دولت اُس نعمت سے بڑی ہے جو ہمارے پاس قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے تو وہ شخص قرآن مجید کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ یہ بات دراصل ان الفاظِ قرآنی کی شرح ہے: ﴿ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ جو کچھ دنیا قیمتی اشیاء سمجھ کر جمع کرتی ہے‘ اُن سے کہیں بڑھ کر قیمتی یہ قرآن ہے۔

فتنوں سے نکلنے کا راستہ

عظمتِ قرآن کے ضمن میں اب تک ایک حدیث حضرت عثمان بن عفّان ﷜ سے‘ ایک حضرت عمر بن الخطاب ﷜ سے اور ایک حضرت ابوبکر صدیق ﷜ سے مروی ہمارے سامنے آئی۔ آخری حدیث حضرت علی ﷜ بن ابی طالب سے مروی ہے۔

مدحِ قرآن کے حوالہ سے یہ طویل ترین اور بہت پیاری حدیث ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ ﷜ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ)) ’’عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا‘‘۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں: فَقُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ

مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ’’تو مَیں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟‘‘ یہاں پر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اگر ہم جیسے عقلیت پسند لوگ ہوتے تو پوچھتے کہ وہ فتنہ کیا ہوگا! کیوں آئے گا؟ کب آئے گا؟ کہاں سے آئے گا؟ ہمارے سوالات اکثر و بیشتر علمی نوعیت کے ہوتے ہیں جبکہ عملی اعتبار سے اہمیت اس بات کی ہے کہ بچاؤ کا راستہ کون سا ہوگا! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہی بات پوچھی' جس پر رسول اللہ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ)) ’’اللہ کی کتاب!‘‘ جس کو تھامو گے تو فتنوں سے محفوظ رہو گے۔ ((فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ)) ’’اس میں خبریں ہیں تم سے پہلوں کی بھی اور تمہارے بعد آنے والوں کی بھی۔‘‘ قرآن مجید میں قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ نوح' قومِ لوط' آلِ فرعون وغیرہ کے واقعات بھی درج ہیں اور بعد میں آنے والوں کے حالات بھی بتائے گئے ہیں مگر وہ بین السّطور (between the lines) ہیں۔ اس کے لیے گہرائی سے غور وفکر اور تدبّر کی ضرورت ہے۔ قرآن میں پاکستان کا ذکر موجود ہے۔ پاکستان کیسے بنا' اس کا بھی ذکر ہے۔ پھر پاکستان حاصل کر کے ہم نے بحیثیت قوم کیا وطیرہ اختیار کیا' اس کا بھی ذکر ہے' اور اب اس کا کیسا انجام ہونے والا ہے' اس کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ الانبیاء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩﴾ ’’(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟‘‘ ((وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ)) ’’اور (تا قیامِ قیامت) تمہارے درمیان جتنے اختلافات پیدا ہوں گے ان کا فیصلہ اس میں موجود ہے۔‘‘

آگے فرمایا: ((هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ)) ’’یہ قرآن ایک فیصلہ کن کتاب ہے' یاوہ گوئی نہیں ہے‘‘۔ یہ شاعروں کی شاعری نہیں ہے۔ یہ تو قوموں کے عروج وزوال کے فیصلے کرنے والی کتاب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کے مطابق اب قوموں کی تقدیر کے فیصلے اس قرآن سے ہوں گے۔ اگر کوئی قوم اُبھرے گی تو قرآن کو لے کر اُبھرے گی اور گرے گی تو قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے گرے گی۔ سورۃ الطارق میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ⑬ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭﴾ ’’بے شک یہ قرآن دوٹوک فیصلہ کرنے

والا کلام ہے' یہ ہنسی کی اور بے فائدہ بات نہیں ہے۔‘‘

حدیث کے اگلے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے فصاحت' بلاغت اور عذوبت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں کس قدر غنائیت بھی ہے۔ فرمایا: ((مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ)) ’’جو شخص اپنے تکبّر کی وجہ سے اس قرآن کو ترک کر دے گا' اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا۔‘‘ ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) ’’اور جو کوئی قرآن کے سوا کسی اور شے میں ہدایت تلاش کرے گا' اللہ اُسے لازماً گمراہ کر دے گا۔‘‘

آگے پھر حدیث کے تین ٹکڑے فصاحت و بلاغت اور عذوبت وغنائیت کی بہترین مثال ہیں۔ فرمایا: ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ)) یہ شاعری نہیں ہے' لیکن آزاد شاعری سے ملتا جلتا انداز ہے۔ ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ’’یہی ہے اللہ کی مضبوط رسّی۔‘‘ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ ’’اللہ کی رسّی کو مل جل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں مت پڑو۔‘‘ وہ اللہ کی رسّی کون سی ہے؟ اسے قرآن میں واضح نہیں کیا گیا' بلکہ اس کی صراحت حدیث سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں اگر کوئی شے تشریح طلب ہو تو اُس کو واضح کرنا حضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ منکرینِ حدیث تو حضور ﷺ کا یہ حق بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن حکیم) نازل کیا تاکہ آپ واضح کر دیں اس کو لوگوں کے لیے جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے۔‘‘ تو آپؐ نے واضح فرما دیا کہ: ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ’’یہ (قرآن) اللہ کی مضبوط رسّی ہے‘‘۔ اس کو پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ: كِتَابُ اللّٰهِ)) (صحیح مسلم:۲۱۳۷)

’’اور میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے

مضبوطی سے پکڑ لو گے تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے‘ وہ کتاب اللہ ہے۔‘‘

ایک اور حدیث میں ہے:

((كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) (الترمذی)

’’اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا) جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسّی ہے۔‘‘

اگر آج دُوَلِ عرب یکجا ہو جائیں تو اسرائیل ایک دن کے لیے قائم نہیں رہ سکتا۔ امریکہ بھی کچھ نہیں کر سکتا اگر اُمّت عرب ہی جمع ہو جائے‘ عالمِ اسلام تو بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے وسائل اور نعمتیں عطا فرمائی ہیں لیکن افتراق‘ انتشار اور گروہ بندیوں کی وجہ سے اسرائیل کا خنجر عرب دنیا کے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ اختلافات کی وجہ سے ان کی ہوا اُکھڑ گئی۔ حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔

علامہ اقبال نے قرآن اور حدیث کے حقائق کو احسن طریقے سے اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام	شرحِ رمزِ صِبْغَةَ الله گفتہ ام

’’مَیں نے قرآن کے بحر بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور ’’صِبْغَةَ الله‘‘ کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔‘‘

کوئی بھی غواص موتی پیدا نہیں کرتا‘ اسے دریا کی گہرائی سے نکالتا ہے۔ یہ میری حکمت نہیں ہے جو میرے اشعار میں ہے‘ یہ موتی تو میں نے قرآن مجید کے دریا میں غوطہ زنی کر کے نکالے ہیں۔ حدیث کے اِس ٹکڑے کو شعر میں یوں لائے ہیں:

از یک آئینی مسلماں زندہ است	پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است!
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست	اعتصامش کن کہ حَبْلُ اللهِ اوست!

’’وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملّتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں‘ ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ اس کو مضبوطی سے تھام لو کہ یہی حبل اللہ (اللہ کی رسّی) ہے!‘‘

قائد اعظم سے جب پوچھا گیا تھا کہ پاکستان کا آئین کیا ہو گا‘ تو انہوں نے یہی فرمایا تھا کہ ہمیں کسی نئے دستور کی ضرورت نہیں‘ ہمارا دستور چودہ سو برس پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے آج قائد اعظم کا دیا ہوا پاکستان دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ہم نے اُس آئین کو اختیار نہیں کیا بلکہ دنیا کے دوسرے نظاموں کو آزمایا۔ قرآن مجید کی تعلیمات کی جانب پیش قدمی نہیں کی۔ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کا جس طرح استہزاء اور تمسخر کر رہے ہیں‘ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری‘ آپ کی اور ارضِ مقدس پاکستان کی حفاظت فرمائے! البتہ اس کے لیے کام کرنا ہو گا‘ صرف کہنے سے بات نہیں بنے گی۔ ایک عزم کے ساتھ نئی تعمیر کرنی ہو گی۔ یہ اُمّت ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن مجید لے کر دوبارہ میدان میں آئے۔

زیر مطالعہ حدیث میں آگے فرمایا: ((وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ)) ’’اور یہی پُر حکمت ذکر ہے۔‘‘ قرآن اپنے آپ کو ’’الذکر‘‘ کہتا ہے‘ لیکن ہم نے ذکر کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ سب سے مضبوط اور مستحکم ذکر یہ قرآن ہے‘ لیکن اس پر توجّہ ہی نہیں‘ جبکہ ذکر واذکار اور اوراد و وظائف کے مجموعے توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

زیر مطالعہ حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ)) ’’اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔‘‘ نماز کی ہر رکعت میں ہم ’’اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ‘‘ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے سیدھے راستے کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اس حدیث میں صراحت آ گئی کہ صراطِ مستقیم یہی قرآن ہے۔

((هُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ)) ’’یہ وہ شے ہے جس کے ہوتے ہوئے خواہشاتِ نفس (تمہیں) گمراہ نہیں کر سکیں گی۔‘‘ اس قرآن سے رابطہ ہو گا تو خواہشاتِ نفسانی ٹیڑھے رُخ پر نہیں لے جا سکیں گی۔

((وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ)) ’’اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکیں گی‘‘۔ اس کے ساتھ سابقہ آسمانی کتابوں والا معاملہ کرنا ممکن نہیں ہو گا کہ ذرا سا زبان کو مروڑ کر پڑھا تو کچھ کا کچھ بن گیا۔ اس طرح اُن کتابوں میں تحریف ہو گئی۔ قرآن حکیم میں اس طرح کی تحریف کے سارے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ قرآن اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ قرآن

میں ہے: ﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۲)
’’اس پر باطل حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا‘ نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔‘‘

آگے فرمایا: ((وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ’’اور اہلِ علم کبھی اس سے سیر نہ ہو سکیں گے۔‘‘ اس پر غور کرتے رہیں‘ تدبر کرتے رہیں‘ پڑھتے رہیں‘ لیکن قرآن سے سیر نہیں ہوں گے۔ یہ اس کا اعجاز ہے۔

((وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ)) ’’اور تکرارِ تلاوت سے اس پر کوئی باسی پن طاری نہیں ہوگا۔‘‘ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے۔ کوئی کتاب ایک دفعہ پڑھی تو اب دوسری دفعہ پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا‘ اور اگر دوسری دفعہ پڑھ لی تو اب اسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہے گا۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اسے پڑھتے رہیے‘ پڑھتے رہیے‘ سینکڑوں دفعہ پڑھ جایئے‘ ہر دفعہ آپ کو نئی چیزیں ملیں گی‘ نئے نئے نکتے ملیں گے۔

امام شافعیؒ اصولِ فقہ کے امام تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فقہ کے چار مآخذ قرآن‘ سُنّت‘ اِجماع اور قیاس کے لیے قرآن سے دلائل جمع کر رہے تھے‘ لیکن اِجماع کے لیے انہیں قرآن سے کوئی دلیل نہیں مل رہی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے تین سو مرتبہ شروع سے آخر تک قرآن پڑھا‘ لیکن دلیل نہیں ملی۔ اس کے بعد جب تین سو ایک مرتبہ پڑھ رہے تھے تو سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ کے ان الفاظ پر توجّہ مرتکز ہوگئی:

﴿...وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۱۱۵﴾﴾ ’’......اور جو کوئی مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اُس کو اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنّم میں جھونک دیں گے‘ اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔‘‘ مسلمانوں کا راستہ وہ ہے جس پر اُمّت کا اجماع ہو جائے‘ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا ہے: ((اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ)) (ابن ماجہ) ’’یقیناً میری اُمّت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔‘‘

آگے فرمایا: ((وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ)) ’’اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔‘‘ علم وحکمت کے ہیرے اور ہدایت کے موتی اس میں سے ابدالآباد نکلتے رہیں گے۔ آج

کی ہدایت اس قرآن مجید سے کھود کر نکالنی پڑے گی۔ ہر دور کے لیے ہدایت اس کتاب میں رکھ دی گئی ہے مگر پوشیدہ ہے۔ اس میں تدبر کی ضرورت ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:
﴿کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾﴾ (صٓ) ’’ہم نے آپ کی طرف ایک برکت والی کتاب اتاری تاکہ وہ غور کریں اس کی آیات پر اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔‘‘ تو معلوم ہوا کہ جس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے‘ اس کو بھی ایک سند حاصل ہے۔ مسلمانوں کے مجمع علیہ راستہ کو ایک دلیل کی حیثیت حاصل ہے۔

((هُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰی قَالُوْا: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾)) ’’یہ وہ کتاب ہے کہ اسے جیسے ہی جنوں نے سنا‘ فوراً پکار اٹھے: ہم نے ایک بہت خوب صورت قرآن سنا ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے‘ تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔‘‘ انسانوں کا حال یہ ہے کہ سینکڑوں مرتبہ سنتے ہیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا‘ جیسے چکنے گھڑے کے اوپر سے پانی بہ جائے جبکہ جنّوں کی جماعت نے اسے ایک مرتبہ سنا تو وہ اس پر ایمان لے آئی۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ الجن کے آغاز میں ہے۔ سورۃ الاحقاف میں بتایا گیا ہے کہ یہ جنّات ایمان لانے کے بعد اپنی قوم کے پاس گئے تو جاتے ہی دعوت وتبلیغ کا آغاز کر دیا۔

اس حدیث کے آخر کے الفاظ یاد کر لینے والے ہیں۔ یہ اس حدیث کا کلائمکس ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ)) ’’جس نے قرآن کے مطابق بات کہی‘ اس نے سچی بات کہی۔‘‘ ((وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ)) ’’جس نے اس پر عمل کیا‘ وہ ثواب کا مستحق ہوا۔‘‘ ((وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ)) ’’جس نے قرآن کے مطابق کوئی فیصلہ کیا‘ اس نے عدل کیا۔‘‘ ((وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ)) ’’اور جس کسی نے قرآن کی طرف بلایا تو اس کو تو صراطِ مستقیم کی ہدایت مل گئی۔‘‘ کسی اور کو ہدایت حاصل ہو یا نہ ہو‘ یہ داعی کے ذمہ نہیں ہے‘ البتہ جو قرآن کی طرف بلا رہا ہے اُس کی ہدایت یقینی (ensured) ہے۔ یہ حدیث امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے اپنی اپنی سنن میں اور امام

بیہقیؒ نے ’’شعب الایمان‘‘ میں نقل کی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق ملے۔ اگر ہم پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی قرآن مجید کی عظمت کا انکشاف ہو جائے تو پھر کسی اور چیز کے پڑھنے میں لذّت محسوس نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ ڈائجسٹ‘ شکاریات اور بھوت پریت کی کہانیاں پڑھنے میں تو دلچسپی ہو لیکن قرآن مجید سے شناسائی ہی نہ ہو۔ عمر کا ایک بڑا حصہ گزر گیا لیکن قرآن مجید کا تعارف ابھی تک دل میں اُتر ہی نہ سکا۔ اس کے جلال و جمال سے کوئی حصہ ہی نہ پا سکے۔ کم از کم ہماری یہ کیفیت ہو جائے کہ قرآن مجید پڑھنے کے بعد اب کسی اور شے کے پڑھنے میں لطف محسوس نہ ہو۔ اگر کوئی دوسری چیز پڑھیں بھی تو اسی لیے کہ قرآن مجید سمجھنے کے لیے مددگار ہو۔ جیسے سبعہ معلقہ کے آخری شاعر سے جب پوچھا گیا کہ اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے‘ تو انہوں نے کہا: ((أَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟)) کیا قرآن نازل ہونے کے بعد بھی اب گنجائش ہے کہ میں شعر کہوں!

اگر کوئی شخص سمندر کے کنارے کھڑا ہو تو بھی اُس میں سے اتنا ہی پانی لے سکتا ہے جتنے حجم کا برتن اُس کے پاس موجود ہوگا۔ سمندر میں پانی کی کمی نہیں۔ اسی طرح اگر ہمارا ظرفِ ذہنی کم ہوگا تو اس میں قرآن مجید کے معارف زیادہ نہیں اُنڈیل سکیں گے۔ چنانچہ ہمیں اپنے ظرفِ ذہنی کو بڑھانا چاہیے اور اس کے لیے دوسرے علوم کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ منطق‘ سائنس اور فلسفہ کا مطالعہ کرنے سے ذہن وسیع تر ہوتا ہے۔ ظرفِ ذہنی کو وسیع کرنے کے لیے اِن علوم کا مطالعہ کیا جائے تاکہ قرآن مجید کے علم و حکمت کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل ہو سکے۔ پھر اِن دُنیاوی علوم کے حصول کے ساتھ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کے مصداق قرآنی علوم کو حاصل کرنے اور پھر پھیلانے والے بننا چاہیے۔ سب سے بڑا سخی وہی ہے جو لوگوں میں ہدایت کے خزانے بانٹتا ہو۔ یہی سب سے بڑی خدمتِ خلق ہے۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ!

❁❁❁

آیت الکرسی

فضیلت‘ مفہوم اور تقاضے

امیر تنظیم اسلامی شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ

مسجد جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی کراچی میں ۳۱/ اکتوبر ۲۰۲۵ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

ابھی آپ کے سامنے ’’آیت الکرسی‘‘ کی تلاوت کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح آج کی نشست میں یاد دہانی کے طور پر پیش کرنا مقصود ہے۔ یہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۵ ہے جو قرآن حکیم کی طویل آیات میں سے ہے۔ احادیث مبارکہ کے مطابق یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت اور تمام آیات کی سردار ہے۔ اس ایک آیت میں دس جملے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا بڑا جامع بیان ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا تذکرہ آیا ہے۔ جس طرح سورۃ الاخلاص کی چار مختصر آیات ہیں اور وہاں ہمیں توحید کا بڑا جامع ذکر ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک جامع تعارف ہمارے سامنے آتا ہے‘ اسی انداز میں یہاں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بہت ہی جامع بیان اس آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا ہم ترجمہ بھی کریں گے‘ کچھ احادیث میں جو اس کی فضیلت کا تذکرہ ہے وہ بھی ہمارے سامنے آئے گا‘ اور اس ایک آیت میں جو دس جملے ہیں اس پر مختصر کلام بھی کریں گے۔ مزید یہ کہ اس کے کچھ وہ پہلو جو ہمارے عمل سے متعلق ہیں‘ ان پر بھی ان شاء اللہ تعالیٰ گفتگو ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ

وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

آیت الکرسی کے فضائل

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا بڑا جامع تذکرہ بھی ہے۔ اس کی فضیلت میں چند احادیث جو اکثر مفسّرین نے تفاسیر میں نقل کی ہیں‘ ان کا حاصل مَیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

☆ آیت الکرسی کی عظمت کے حوالے سے صحیح مسلم کی حدیث ہے‘ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے۔

☆ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ آیت الکرسی تمام آیتوں کی سردار ہے۔

☆ ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد اس کی تلاوت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

☆ ایک حدیث میں ارشاد ہوا کہ جو کوئی ہر فرض نماز کے بعد اس کا اہتمام کرے تو اللہ تعالیٰ اگلی نماز تک اس کی حفاظت فرمائے گا۔

☆ ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ جو کوئی ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت کا اہتمام کرے تو جنت میں اس کے داخلے میں موت ہی رکاوٹ ہے۔ یعنی جیسے ہی اس کی موت واقع ہوگی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

☆ ایک طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ کو رسول اللہ ﷺ نے مالِ زکوٰۃ کی حفاظت پر مامور کیا۔ رات کو ایک شخص آیا اور غلہ چوری کرنے لگا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے پکڑ لیا‘ لیکن اُس نے یہ بہانہ بنا کر جان چھڑا لی کہ میں بہت محتاج ہوں اور میرے بچے بھوک پیاس سے مر رہے ہیں۔ میں نے ترس کھا کر اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا: اے ابوہریرہ! رات تمہارے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے سارا ماجرا سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تم سے جھوٹ بول کر گیا ہے اور پھر آئے گا۔ چنانچہ دوسری رات بھی وہ آ کر غلّہ اٹھانے لگ گیا۔ میں نے پھر اسے پکڑ لیا لیکن اب بھی اس کی وہی التجا تھی‘ مجھے پھر اس پر رحم آ گیا اور اسے چھوڑ دیا۔ صبح پھر رسول اللہ ﷺ نے وہی استفسار فرمایا کہ ابوہریرہ! رات تمہارے قیدی نے کیا کیا؟ اس پر میں نے رات والا واقعہ پھر سنایا۔

آپ ﷺ نے اس مرتبہ بھی یہی فرمایا: وہ تم سے جھوٹ بول کر گیا ہے اور پھر آئے گا۔ تیسری رات میں اس کی تاک میں تھا کہ اس نے پھر آ کر غلہ اٹھانا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا: اب تو میں تجھے ضرور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا: اگر تم مجھے جانے دو گے تو میں تمہیں ایسے چند کلمات سکھا دوں گا جن کے پڑھنے سے اللہ کی طرف سے تمہاری اور تمہارے مال کی صبح تک حفاظت کی ضمانت ہوگی۔ اُس نے کہا کہ رات کو بستر پر لیٹنے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ایک نگران فرشتہ مقرر رہے گا اور صبح تک شیطان تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ اس پر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے استفسار کرنے پر میں نے پورا واقعہ آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اگرچہ وہ پرلے درجے کا جھوٹا ہے لیکن تم سے یہ بات سچ کہہ گیا ہے۔‘‘ پھر آپ ﷺ نے ابوہریرہ ؓ کو بتایا کہ ’’وہ شیطان تھا۔‘‘ (صحیح البخاری: ۲۳۱۱)

☆ ایک حدیث میں ذکر ہے کہ رات کو سوتے وقت اس کی تلاوت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ویسے تو رات کے اور مسنون معمولات بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم سمارٹ فون کو بند کر کے سوئیں‘ ورنہ وہ کھلا رہتا ہے اور ہم سو جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت الکرسی اور دیگر مسنون معمولات کی جگہ کچھ اور ہی چل رہا ہوتا ہے۔

رات کے معمولات میں آیت الکرسی کے علاوہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات جو معراج کی شب عطا ہوئیں‘ ان کی تلاوت بھی ہے۔ اسی طرح سورۃ الکافرون کی تلاوت بھی ہے۔ پھر سورۃ الاخلاص‘ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تلاوت کر کے ہاتھوں پر پھونکنا اور پورے جسم پر پھیرنا اور یہ عمل تین مرتبہ کرنا مسنون ہے۔ سورۃ الملک کی تلاوت کرنا بھی ثابت ہے جو کہ قبر کے عذاب سے بچانے والی اور شفاعت کرنے والی ہوگی۔ اسی طرح رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہ کا اہتمام کرنا بھی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

☆ ایک حدیث میں یہ ذکر بھی آیا کہ جس گھر میں آیت الکرسی کی تلاوت کا اہتمام ہو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ چنانچہ حفاظت کے اعتبار سے آیت الکرسی بڑی عظیم آیت ہے جو ہمیں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے کی اور اس کو اپنے معمولات میں شامل رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آیت کریمہ کا مطالعہ

اب ہم اس آیت کریمہ (آیت الکرسی) کا ترجمہ، مختصر تشریح، اور اس میں موجود دس جملوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا جامع تعارف

آیت الکرسی کی ابتدا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ﴾

’’اللہ وہ معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔‘‘

اسم ’’اللہ‘‘ کو اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام مانا جاتا ہے۔ باقی سب اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، جیسے الرحمٰن، الرحیم، الحکیم، السمیع، البصیر، الخبیر وغیرہم۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، ایسے ہی اُس کی صفات کا مکمل احاطہ کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ کچھ تعارف ہمیں اُس کی صفات کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ سارا جمع ہو کر اسم ’’اللہ‘‘ میں آجاتا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ’’اُس (اللہ) کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں‘‘۔ اِلٰہ کا عام ترجمہ معبود کیا جاتا ہے جو کہ بالکل ٹھیک ہے، البتہ الٰہ کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ہستی جس سے سب سے بڑھ کر محبت کی جائے، جس کی طرف لپکا جائے، وہ ہستی جسے مشکلات میں پکارا جائے، وہ ہستی جس کی طرف سب سے بڑھ کر محنتیں کی جائیں۔ یہ تمام مفاہیم بھی الٰہ میں شامل ہیں اور ان کا اصل حق دار اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ’’اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبّت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔‘‘ اس کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر جدوجہد اللہ کے لیے ہو۔ قربانی کے موقع پر بھی ہم یہ الفاظ ادا کرتے ہیں:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

’’یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

الٰہ کا یہ مفہوم بالکل ٹھیک ہے کہ وہ ذات جس کی عبادت کی جائے، اور اللہ ہی عبادت کے

لائق ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر مخلوق میں سے کسی کو بھی پکارو گے تو تم اپنے شرف کو کھو دو گے۔ انسان کو تو اشرف المخلوقات بنایا گیا۔ تمام انبیاء کی یہی دعوت تھی کہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ﴾ (الاعراف:۵۹) ’’اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے۔‘‘

(۲) اللہ تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے

﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ﴾

’’وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے۔‘‘

اَلْحَیُّ وہ ہے جو از خود زندہ ہو۔ اُس کی زندگی کا انحصار کسی اور پر نہیں ہے۔ اُس کی زندگی مستعار (borrowed) نہیں ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ کا ترجمہ: قائم رکھنے والا، تھامنے والا، نشوونما کرنے والا، ربوبیت کرنے والا، ایک ایک حاجت کو پورا کرنے والا، مشکلات کو دور کرنے والا، مخلوق کی زندگی کو برقرار رکھنے والا۔ یہ سارے مفاہیم اَلْقَیُّوْمُ میں شامل ہیں۔ اَلْحَیُّ از خود زندہ ہے جبکہ اَلْقَیُّوْمُ سب کو تھامنے والا ہے۔ ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بڑی پیاری بات کہی کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ’’احد‘‘ ہے اور ساری کائنات اور مخلوق کے لیے ’’صمد‘‘ ہے۔ جیسے سورۃ الاخلاص میں فرمایا:

﴿قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾﴾

’’کہہ دیجیے وہ اللہ یکتا ہے، اللہ سب کا مرجع ہے۔‘‘

اللہ اکیلا ہے۔ اس کا وجود از خود ہے۔ باقی سب کا وجود اُس کے دم سے ہے۔ الصمد سے مراد یہ ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ احادیث کی روشنی میں اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ آیت الکرسی کے پہلے دو جملوں (اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ) کو پڑھ کر اگر دعا مانگی جائے تو اللہ قبول فرماتا ہے۔ اس کو اور finetune اس طرح کیا گیا کہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ میں اسم اعظم موجود ہے۔ چنانچہ ایک روایت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے پوری رات حضور ﷺ حالتِ سجدہ میں دعا کر رہے تھے تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے سنا حضور ﷺ بار بار ’’یاحی یا قیوم‘‘ پکار کر دعا کر رہے

تھے۔ایک اور مشہور اور مسنون دعا ہم سب کو یاد ہوگی: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یقین کے ساتھ مانگنے والا بنائے! دعائیں رٹنی نہیں چاہئیں۔محض الفاظ ادا نہیں کر دینے چاہئیں‘ بلکہ دعا کا ترجمہ بھی یاد ہو۔ مانگتے تب ہیں جب ہمیں اپنی محتاجی کا احساس ہو۔اللہ کی عظمتوں کا ہمیں ادراک ہونا چاہیے۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کے بارے میں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں اسم اعظم موجود ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ غافل نہیں

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾

’’نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند۔‘‘

اونگھ کیا ہے؟ یہ نیند کا مقدّمہ ہے۔اونگھ کے بعد نیند آتی ہے۔تھکاوٹ اور دیگر وجوہات کی وجہ سے بندہ تھوڑا غفلت میں جاتا ہے تو اونگھ سی آتی ہے۔جب سارے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور ادراک‘ فہم‘ غور وفکر کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے تو یہ نیند کی کیفیت ہے۔اللہ تعالیٰ کو نہ تو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔اس کے ساتھ کوئی غفلت کا‘ کوئی تھکاوٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تصورات مسیحیت کے ماننے والوں میں ہیں اور بائبل کے تمام معروف نسخوں میں یہ الفاظ موجود ہیں:

" For in six days the LORD made the heavens and the earth, the sea, and all that is in them, but he rested on the seventh day." (Exodus 20:11)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کو چھ دنوں میں بنایا اور ساتویں دن تھک گیا تو اُس نے آرام کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ! اللہ کے ساتھ کوئی کمزوری وابستہ نہیں ہے۔ یہ تو مخلوق کا مسئلہ ہے۔اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ تھک جائے یا اسے اونگھ اور نیند آئے۔مخلوقات میں سے بعض پیغمبروں کو اللہ کی الوہیت میں شامل کر دیا گیا۔مسیحیت کے ماننے والوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کا درجہ دے دیا جبکہ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ سوتے بھی تھے‘ انہوں نے کھایا پیا بھی‘ ان پر بیماری کا معاملہ بھی آیا تھا۔جس میں یہ کمزوریاں ہوں وہ معبود نہیں ہو سکتا۔اللہ وہ ہے جو اَلْقَیُّوْمُ ہے۔ ہر ایک کو تھامنے والا اور ہر ایک کی حاجات کو پورا کرنے والا ہے۔اس کائنات کو بنانے اور چلانے والا ہے۔اس کے اِذن کے بغیر ہماری زندگی

برقرار نہیں رہ سکتی۔ایک صاحب دل جو باطن کے معاملات پر کلام کرتے ہیں‘ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توجہ تو تمہاری طرف سے کبھی نہیں ہٹتی لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم اللہ کو بھلا دیتے ہو‘ فراموش کر دیتے ہو‘ اُس کے احکامات کو پامال کرتے ہو۔اُس کی نعمتیں استعمال کرتے ہو مگر اُس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ڈاکٹرز کے کہنے پر حلال کو چھوڑ دیتے ہو لیکن اللہ کے کہنے پر حرام کو نہیں چھوڑتے۔تمہیں ایمان مطلوب نہیں ہے‘ اپنی روحانی ترقی مطلوب نہیں ہے۔جنت تمہیں مطلوب نہیں ہے۔اللہ کو پا لینا اور اُس کو راضی کر لینا تمہیں مطلوب نہیں ہے۔تم کس قدر غفلت میں چلے جاتے ہو‘ لیکن اللہ تعالیٰ بالکل بھی غافل نہیں ہے۔اللہ ہمیں غفلت سے محفوظ رکھے!

(۴) اللہ زمین وآسمان کا مالک ہے

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾

’’جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔‘‘

ہم روزانہ ان الفاظِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہیں لیکن پھر بھی حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ میرا جسم‘ میرا مال‘ میری جائیداد‘ میرا اختیار‘ میری کرسی‘ میرے اصول۔ کس بات کا ’’میں میں میں‘‘ لگا رکھا ہے ہم نے! یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کے الفاظ قرآن کریم میں اس کائنات کی وسعتوں کو بیان کرنے کے لیے آتے ہیں‘ اور ان وسعتوں کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ بگ بینگ سے expansive یونیورس کے تصوّرات تو ہمارے سامنے آ گئے ہیں مگر جتنا انسان آگے بڑھ رہا ہے اتنا اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ کائنات ابھی غیر دریافت شدہ (unexplored) ہے۔کائنات کی وسعتوں کو بیان کرنے کے لیے قرآن کریم کے عام الفاظ یہ ہیں کہ آسمان اور زمین اللہ ہی کے لیے ہیں‘ اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں جبکہ بندے تو trustees ہیں‘ custodian ہیں‘ امین ہیں ۔ یہ وجود اللہ کا عطا کردہ ہے‘ اس کے بارے میں مَیں نے جواب دینا ہے۔ مال اللہ کا عطا کردہ ہے‘ اس کے بارے میں جواب دینا ہے۔اولاد اللہ کی عطا کردہ ہے‘ اس کے بارے میں جواب دینا ہے۔یہ کائنات ربّ تعالیٰ نے میرے لیے سجائی‘ بے شمار نعمتیں اُس نے عطا فرمائیں جن کا کل جواب دینا ہے۔﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۸﴾ (التکاثر) ’’پھر اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں۔‘‘ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حساب کو آسان فرمائے!

یہ پورا عقیدہ اس میں بیان ہو گیا کہ تمہارا کچھ بھی نہیں‘ سب کچھ اللہ کا ہے۔ لہٰذا بندے بندوں پر حاکم بن کر نہ بیٹھ جائیں۔ بندے بندوں کو غلام نہ سمجھ لیں۔ پیغمبروں کی دعوت کا ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر رب کی غلامی میں لے آئیں۔ بندوں کے پاس جو کوئی نعمت‘ اختیار‘ طاقت یا مال ہے وہ اللہ کی امانت ہے اور اس کے ذریعے بندوں کی آزمائش کی جا رہی ہے۔ جامع ترمذی کی روایت ہے کہ روزِ محشر ابنِ آدم کے قدم اُس کی جگہ سے ہٹ نہیں سکیں گے جب تک وہ پانچ سوالات کے جوابات نہ دے دے۔ زندگی کہاں لگائی؟ جوانی کہاں کھپائی؟ مال کہاں سے کمایا؟ مال کہاں خرچ کیا؟ جو علم حاصل کیا اس پر کتنا عمل کیا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے لیے تیاری کی توفیق عطا فرمائے!

(۵) اللہ کا کوئی سفارشی نہیں

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط﴾

’’کون ہے وہ جو شفاعت کر سکے اُس کے پاس کسی کی مگر اُس کی اجازت سے!‘‘

ایک شفاعت وہ ہے جو روزِ قیامت امام الانبیاء ﷺ فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی مکرم ﷺ کی شفاعت عطا فرمائے! پھر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے انبیاء‘ صِدّیقین‘ شہداء‘ حُفّاظ‘ حُجّاج بھی اپنے اپنے دائرے میں رہ کر سفارش کریں گے۔ احادیث میں تذکرہ آتا ہے ان کو اللہ کے اذن سے شفاعت کرنے کا حق ملے گا۔ تاہم سفارش اللہ کے حکم سے ہو گی۔ یہ بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اسی سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ مطلق شفاعت کی نفی فرمائی ہے۔ دو مرتبہ بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا: ﴿وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ﴾ (آیت ۴۸) ’’اور اُس سے کوئی شفاعت قبول نہ کی جائے گی‘‘ اور ﴿وَلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ﴾ (آیت ۱۲۳) ’’اور کوئی شفاعت اس کے کام نہیں آئے گی‘‘۔ اور یہاں پر ذکر کیا جا رہا ہے اسی آیت سے پہلے:

﴿یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ ط﴾ (آیت ۲۵۳)

’’وہ دن کہ جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو گی‘ نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت مفید ہو گی۔‘‘

البتہ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے استثناء (exeption) دیا ہے کہ اللہ کے حضور شفاعت کا امکان ہے اور وہ اللہ کے اِذن سے ہو گی۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

﴿یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾﴾

’’اُس دن کوئی شفاعت ہرگز مفید نہیں ہو گی مگر جس کے لیے رحمٰن نے اجازت دی ہو‘ اور اُس کے لیے اُس نے بات پسند کی ہو۔‘‘

معلوم ہوا کہ اصل شافع تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے‘ اُس کے اِذن سے شفاعت ہو گی اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا اُس کے لیے ہو گی۔ معاملہ یہ ہے کہ بقیہ لوگوں کے مقابلے میں سب سے بڑھ کر امام الانبیاء ﷺ کو مقامِ محمود عطا ہو گا۔ اللہ شفاعتِ کُبریٰ کا حق نبی مکرم ﷺ کو دے گا۔ پھر دیگر انبیاءؑ نیک بندوں کا مقام لوگوں کے سامنے واضح فرمائے گا کہ تم شفاعت کرو‘ میں فلاں فلاں کو بخش دوں گا۔ البتہ اس میں مزید تفصیلات کے لیے تفاسیر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

روزِ محشر کے حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ کا جو جلال ہو گا اس کے سامنے تو انبیاء‘ صِدّیقین‘ شہداء‘ صالحین اور فرشتے سب لرزاں و ترساں ہوں گے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ ہو گی کہ وہ اللہ کے سامنے کلام کر سکے۔ اللہ تعالیٰ جب اجازت دے گا تو کلام ہو سکے گا‘ اور اللہ اجازت دے گا تو شفاعت ہو سکے گی۔ یہ بھی اللہ ربّ العالمین کی عظمت کا تذکرہ ہے کہ کون ہے جو اس کے سامنے بات پیش کر سکے‘ کون ہے جو اس کے سامنے شفاعت کر سکے مگر اسی کے اذن سے!

﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ ط﴾ (سبا:۲۳)

’’اور نہ نفع دے گی اُس کے ہاں کوئی سفارش مگر اُسی کے حق میں جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو۔‘‘

(۶) اللہ ظاہر و باطن سے باخبر ہے

﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج﴾

’’وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔‘‘

بعض مفسرین نے اس سے یہ مراد بھی لی ہے کہ اللہ ایک بندے کی پیدائش سے پہلے کے حالات سے بھی واقف ہے اور بندے کی موت کے بعد جو کچھ ہو گا وہ سب بھی اللہ کے علم میں

ہے۔ لہٰذا جب پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد کا کُل علم اللہ ہی کے پاس ہے تو وہ حال کے متعلق کیوں نہ جانے گا کہ بندہ جب زمین پر چل پھر رہا ہے تو کیا بول رہا ہے‘ کیا سوچ رہا ہے۔ ایک اور مراد یہ لی گئی کہ جو کچھ بندے کے ظاہر میں ہے یعنی اس کا قول و فعل‘ کردار‘ اخلاقیات اور جو کچھ اس کے باطن میں ہے یعنی اس کی نیت‘ ارادے اور خیالات سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔

تیسری بات معروف ہے کہ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ’’اللہ غیب کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی۔‘‘ اللہ کے لیے غیب اور ظاہر کی تقسیم نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے لیے ہے کہ ہم سب کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے‘ سب کچھ دیکھتا ہے۔ ہمیشہ سے سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ جو چیز ہمارے اعتبار سے hidden اور unseen ہے‘ ہمارے اعتبار سے غیب میں ہے‘ اللہ اسے بھی جانتا ہے۔

(۷) اللہ جس کو چاہتا ہے‘ علم عطا کرتا ہے

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾

’’اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھنا ناممکن ہے لیکن اللہ کی صفات کے ذریعے اس کا کچھ تعارف ملتا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھی سو فیصد سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ کی دو صفات کے ساتھ کُل کا لفظ قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾﴾ (البقرۃ) ’’اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ ’’اور وہ ہر بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔‘‘ کُل کا لفظ اللہ کے پورے علم اور اس کی پوری قدرت کا عکاس ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور اس کے علم نے پوری کائنات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ وہ کائنات کے ایک ایک ذرے پر گزرنے والے حالات کی مکمل واقفیت رکھتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں سے کسی شے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر سوائے اُس کے جو اللہ چاہے۔ اب اس میں تفصیل ہے کہ علم تو اللہ نے مخلوق کو بھی عطا کیا‘ انبیاء کو بھی عطا کیا اور سب سے بڑھ کر امام الانبیاء ﷺ کو

عطا کیا۔ بعض لوگ غلطی کر جاتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے علم پر بحثیں کرتے ہیں اور ناپنے بیٹھ جاتے ہیں۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ! اس ضمن میں اصولی بات یہ ہے کہ اللہ کا علم ذاتی ہے‘ اپنا ہے‘ جب کہ مخلوق میں سے ہر کسی کا علم عطائی ہے‘ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ کا علم ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ فلسفے کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کا علم ’’قدیم‘‘ ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ مخلوق کا علم نہ ہمیشہ سے ہے‘ نہ ہمیشہ رہے گا‘ یہ پلس مائنس بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو فلسفے کی اصطلاح میں ’’حادث‘‘ کہتے ہیں۔

تیسری سادہ سی بات ہے کہ اللہ کا علم لامحدود جبکہ مخلوق کا علم محدود ہے۔ انبیاء و رُسل علیہم السلام کو سب سے بڑھ کر اللہ نے علم عطا کیا مگر اللہ کے علم کے مقابلے میں ان کا علم بھی محدود ہے۔

یہ فلسفے سے ہٹ کر چونکہ عقیدے کے مسائل بھی ہیں‘ ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی اس موضوع پر معروف کتاب ہے ’’حقیقت و اقسامِ شرک۔‘‘ ان کے چھ گھنٹے کے آڈیو کیسٹس بھی اب ڈیجیٹائز ہو چکے ہیں‘ وہ ماسٹر پیس ہیں۔ پھر انہوں نے ۱۹۸۵ء میں ابوظبی میں نو دن خطابات کیے تھے‘ وہ بھی موجود ہیں۔ بعد ازاں جب ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ ہندوستان تشریف لے گئے تھے تو وہاں بھی انہوں نے اس موضوع پر خطاب کیا تھا۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ اللہ کی صفات ذاتی ہیں‘ قدیم ہیں‘ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ یہ لامحدود ہیں۔ مخلوق کی صفات عطائی ہیں‘ حادث ہیں‘ ہمیشہ سے نہیں ہے اور ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ مخلوق کی صفات محدود ہیں۔ اگر یہ اصول سامنے رہیں تو بہت ساری علمی غلطیوں یا بحثوں سے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم بچ جائیں گے۔

(۸) اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾

’’اس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔‘‘

قرآن مجید کا یہ مقام متشابہات میں سے ہے۔ متشابہات قرآن پاک کے وہ امور ہیں جن کی حقیقت ہمارے علم میں نہیں۔ ان باتوں کو ہم مانتے ہیں۔ اللہ کی جنت کیسی ہے‘ اسے بس اتنا ہی بیان کر سکتے ہیں جتنا قرآن و سُنّت میں وضاحت آئی۔ پوری حقیقت بیان نہیں ہو سکتی۔

جنّات کو سائنسی طور پر بیان نہیں کر سکتے‘ لیکن ان کی موجودگی کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کو بھی مانتے ہیں‘ اگرچہ کسی لیبارٹری میں اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ ہمارے ساتھ دو فرشتے ہیں کراماً کاتبین۔ یہ غیب کے مسائل ہیں۔ بہرحال‘ اللہ کی کرسی کا عام مفسرین نے اس کے اقتدار اور عظمت کے حوالے سے ترجمہ کیا ہے۔ اللہ کا اقتدار اور اختیار پوری کائنات پر ہے۔

یہ کائنات کتنی وسیع ہے انسان ابھی تک اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔ اس پوری کائنات پر جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے‘ کُل اقتدار‘ کُل اختیار اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہے۔

ایک اور مفہوم بھی بیان کیا گیا کہ کوئی کرسی یا تخت ہے لیکن اس کی کیفیت کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے ان امور کا تذکرہ جب بھی آتا ہے تو بچپن سے عقیدے کے الفاظ ہمیں یاد ہیں:

((اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ))

’’میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات کے ساتھ ہے‘ اور میں نے اُس کے تمام احکام کو قبول کیا‘ زبان سے اقرار کرتے ہوئے اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے۔‘‘

ایک حدیث میں ذکر ہے کہ حضرت ابوذر غفاری ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اللہ کی کرسی کیسی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’ابوذر! یہ آسمان وزمین اللہ کی کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک صحرا میں انگوٹھی ہو۔‘‘ اللہ کی کرسی کے سامنے آسمان وزمین کی وسعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اللہ اکبرُ کبیراً ! ایسے میں اس زمین پر بسنے والوں کی اوقات اور حیثیت کیا ہے!

(۹) کائنات کا نظام اللہ کو تھکا نہیں سکتا

﴿وَلَا یَـــُٔوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ۚ﴾

’’اور اس پر گراں نہیں گزرتی ان دونوں کی حفاظت۔‘‘

کائنات کس قدر وسیع ہے‘ ہم نہیں جانتے اور اس کائنات کے اندر کیا کچھ ہے‘ وہ بھی ہم نہیں جانتے مگر اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا نظام چلاتے ہوئے ذرہ برابر بھی نہ تو غافل ہوتا ہے اور نہ ہی تھکتا ہے۔ تھکاوٹ تو کمزوری کی علامت ہے اور جس میں کوئی کمزوری ہو‘ وہ مالک‘ معبود اور ربّ کیسے ہوسکتا ہے!

(۱۰) اللہ سب سے عظیم ہے

﴿وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾

’’اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔‘‘

ان سب باتوں کو سننے کے بعد بندہ یہی کہے گا: **وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ** وہی سب سے بلند مرتبے والا ہے‘ وہی سب سے بڑھ کر عظمتوں والا ہے۔

یہ ہے آیت الکرسی۔ ہر فرض نماز کے بعد اس کی تلاوت کی تلقین کی گئی ہے۔ میں اور آپ یہ باتیں مانتے ہیں۔ اس قدر عظیم رب کے لیے ہمارے مسائل حل کر دینا‘ اُمّتِ مُسلمہ کو زوال سے نکال کر عروج عطا کرنا کون سا مشکل ہے! کیا آج ہم اس عظیم رب پر اتنا ایمان رکھتے ہیں جتنا کہ رکھنے کا حق ہے؟

بتوں سے تجھ کو امیدیں‘ خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

اللہ کی مدد اور نصرت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس پر دلی یقین والا ایمان لائیں۔ اُس کے احکامات کو مانیں۔ اُسی پر توکّل اور بھروسا کریں۔ ہماری زندگی کی ہر جدّ و جہد‘ ہر عمل اُس کی رضا کے لیے ہو۔ اُس کے دین کی سربلندی‘ غلبہ و قیام کے لیے جدّ و جُہد کریں۔ جب یہ ہوگا تو اُس عظیم ربّ کی مدد ہمیں حاصل ہوگی اور ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے‘ ان شاء اللہ!

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

اللہ تعالیٰ ہمیں آیت الکرسی کے فضائل کو سمجھتے ہوئے اس کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا کرنے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین oo

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

خود احتسابی

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور!

ایوب بیگ مرزا

آج انسان عالمی سطح پر ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو حقیقت میں ایک مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اِس مسئلہ کا حل یا اِس مرض سے نجات صرف اسلام کے سنہری اصول اپنانے سے ہی ممکن ہے۔ لیکن افسوس، صد افسوس کہ یہ مرض اُمتِ مُسلمہ کو باقی اقوام اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے کہیں زیادہ لاحق ہے۔ یہ مرض ہے دروں بینی سے انکار اور فرار کا، یعنی اپنے گریبان میں منہ نہ ڈالنا اور دوسروں پر بڑھ بڑھ کا تنقید کرنا، یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنی آنکھ کے شہتیر کے ہوتے ہوئے دوسرے کی آنکھ کے تنکے پر طوفان اٹھا دینا۔ اسلام خود احتسابی کا شدت سے قائل ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق تو اگر آپ کسی کی غیر موجودگی میں اُس کے ایسے عیب کا ذکر کر رہے ہیں جو اُس میں واقعتاً موجود ہے تو یہ غیبت ہے، اور اگر اُس میں وہ عیب نہیں تو یہ بہتان ہے۔ افسوس آج پاکستان کی سیاست میں غیبت ہی نہیں بہتان تراشی بھی رچ بس گئی ہے۔ سب اس مرض میں مبتلا ہیں، صرف کمی بیشی کا معاملہ ہے۔ کوئی آئینہ کے سامنے کھڑا ہونے کو تیار نہیں۔ بانی پی ٹی آئی نے اپنی سیاسی زندگی میں خاص طور پر وزارتِ عظمیٰ سے برخاست ہونے کے بعد جرأت، بہادری اور دیانت داری کے حوالے سے تو ایک مثال قائم کی لیکن غیبت اور الزام تراشی میں اگر وہ کسی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اپنے کسی حریف کو میر جعفر اور میر صادق کہا اور کسی کو پالش کرنے والا کہہ کر پکارا۔ یہ کسی ایسے شخص کے شایانِ شان نہیں جو اسلامی مملکت کا سربراہ بننا چاہتا ہو یا بننے جا رہا ہو۔ پھر کبھی نہ کبھی یہ سب کچھ خود اُس کے سامنے بھی آ جاتا ہے۔ حال ہی میں بانی پی ٹی آئی کے سامنے یہ بڑے مبالغہ کے ساتھ آیا ہے جبکہ وہ نہ صرف غیر حاضر تھے بلکہ اڑھائی سال سے پابند سلاسل بھی۔ یقیناً اِس سے جرم کی نوعیت اور

کیفیت مزید بڑھ جاتی ہے جب آپ کسی ہاتھ پاؤں بندھے انسان پر الزام تراشی کرتے ہیں اور الزامات بھی ایسے جن میں درحقیقت آپ خود سرتا پا ملوث ہیں لیکن نشانہ اپنے سیاسی حریف کو بنا رہے ہوں۔

آیئے ذرا کھل کر بات کریں۔ مسلم لیگ (ن) کے سربراہ جنہیں اُس شام سے چپ لگی ہوئی تھی جب فروری ۲۰۲۴ء کے انتخابات کے نتائج سامنے آئے تھے اور وہ مایوسی کی حالت میں اُس وکٹری سپیچ کو لپیٹ کر واپس لے گئے تھے جو اپنے حق میں نتائج آنے کی صورت وہ کرنا چاہتے تھے۔ نتائج اُن کے لیے غیر متوقع ہی نہیں بلکہ بڑے بھیانک تھے۔ پھر جب رات کی تاریکی نے اصلی نتائج کو نگل لیا اور صبح کو وہ نتائج سامنے رکھ دیے گئے جن کا پاکستان کے عوام سے دور کا تعلق بھی نہ تھا تو پھر اگلے روز بڑوں نے بلکہ بہت بڑوں نے اُن سے گن پوائنٹ پر وکٹری سپیچ کروائی۔ اِس صبح کو تحریکِ انصاف والے ''صبحِ بے نور'' کہتے ہیں، اور کہتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دو سال ہونے کو ہیں لیکن پاکستان کے سیاسی افق پر اُجالا نہیں ہو رہا اور صبحِ کاذب کا دورانیہ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال دوسری طرف یہ ہوا کہ بڑے میاں صاحب نہ صرف وزیر اعظم بننے سے انکاری ہوئے بلکہ اُنہوں نے مسلسل چُپ بھی سادھ لی۔ البتہ برادرِ خُرد کو وزیر اعظم اور اپنی لختِ جگر کو پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب کی سربراہ بنا کر شاندار پروٹوکول سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حرج نہ سمجھا، جو آخری خبریں آنے تک تزک واحتشام سے جاری وساری ہے۔ چُپ کے اِس روزے کی افطاری اُنہوں نے چند ہفتے پہلے اِس بیان سے کی کہ ''عمران خان اکیلا مجرم نہیں ہے بلکہ اُس کو لانے والے بڑے مجرم ہیں۔'' گویا اُس وقت کی اسٹیبلشمنٹ کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ قارئین کرام اِس بات کو اچھی طرح یاد رکھیں کہ راقم نے بات کا آغاز اُس قومی مرض سے کیا تھا کہ ہم اپنے گریبان میں منہ نہیں ڈالتے اور دوسروں پر الزام تراشی سے گریز نہیں کرتے۔ آیئے بڑے میاں صاحب کے اِس بیان کا اسی حوالے سے جائزہ لیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ راقم کو دیانت داری اور غیر جانب داری سے اِس بیان کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھنے اور واضح کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اِس میں رتّی بھر شک نہیں کہ عمران خان کو وزیراعظم بنانے میں اُس وقت کی اسٹیبلشمنٹ نے اہم رول ادا کیا‘ بلکہ مزید آگے بڑھ کر یہ کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ عمران خان وقت کی اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے بغیر وزیراعظم نہیں بن سکتے تھے۔ یہ بھی مکمل طور پر حق بات ہے کہ عمران خان جب اپنے طور پر سیاست میں آئے تو انتخابات میں بمشکل اپنی نشست ہی جیت سکے اور اُن کی جماعت کو انتخابات میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ پھر جب وزیراعظم تراشنے والا ادارہ میاں نواز شریف سے ناراض ہوا تو اُس کی نظر عمران خان پر پڑی‘ لہٰذا وہ وزیراعظم بننے میں کامیاب ہوگئے۔ البتہ آغاز میں عمران خان کی سیاست کا اسٹیبلشمنٹ سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ آج نواز شریف جن لانے والوں کا ذکرِ خیر کر رہے ہیں اور اُن پر طعن کر رہے ہیں‘ درحقیقت خود میاں صاحب کی اپنی سیاسی پیدائش خاکی گملے میں ادارے کی چاردیواری کے اندر ہوئی۔ پہلے اُنہیں پنجاب کا مارشلائی وزیرخزانہ بنایا گیا۔ غیر جماعتی اسمبلی کا رکن بنانے میں اسی ادارے کے اعلیٰ عہدہ داروں نے کلیدی رول ادا کیا جس پر میاں صاحب آج سیخ پا ہیں۔ پھر پنجاب کا غیر جماعتی وزیراعلیٰ بنایا۔ میاں صاحب نے ضیائی مارشل لاء اور غیر جماعتی انتخابات میں اتنی محنت اور اخلاص سے کام کیا کہ جنرل ضیاء الحق کی یہ دعا کہ نواز شریف کو میری عمر لگ جائے‘ تمام پاکستانی اخبارات کی شہ سرخی بنی۔ میاں نواز شریف نے بھی اس کا حق ادا کیا۔ جب جنرل ضیاء الحق ایک فضائی حادثہ کا شکار ہوئے تو اگلے سال اُن کی قبر پر اُن کے صاحبزادے اعجاز الحق کو اپنی بغل میں لے کر اعلان کیا کہ میں ضیاء الحق کے مشن کی تکمیل کروں گا (لیکن بعدازاں ضیاء الحق کے بیٹے سے جو سلوک کیا اُس سے دنیا واقف ہے)۔ میاں صاحب کی کہاں کہاں اور کیسے کیسے خاکی مدد ہوئی‘ یہ اتنی طویل داستان ہے کہ اس پر تو کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ راقم اسی پر اکتفا کرتا ہے اور عرض گزار ہے کہ میاں صاحب اپنے گریبان پر اگر دُور سے بھی نگاہ ڈال لیتے تو شاید یہ بیان دینے کی نوبت نہ آتی اور اُنہیں سوشل میڈیا پر اپنے ایک سوال کے اتنے زیادہ جوابات نہ سننے پڑتے۔ اب ایک دنیا یہ سوال کر رہی ہے کہ میاں صاحب نے اُس دور کی اسٹیبلشمنٹ پر یہ اچانک حملہ کیوں کیا ہے! کیا وہ جانتے نہیں کہ نئی وردی پرانی وردی پر داغ بلکہ اُس پر تیکھی نگاہ ڈالنے کو بھی پسند نہیں کرتی۔

آخر میاں صاحب نے یہ رِسک کیوں لیا ہے؟ پہلے تو یہ جان لیجیے کہ یہ بیان اُن

نئے نویلے مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے دیا گیا جو ضمنی انتخابات میں کامیاب ہو کر میاں صاحب سے مبارک باد وصول کرنے آئے تھے۔ اِن انتخابات کا پی ٹی آئی نے بائیکاٹ کیا تھا۔ اِن میں ووٹ ڈالنے کی شرح ۸ سے ۱۳ فی صد تک بتائی جاتی ہے اور عالمی ادارہ فافن اِس کی شفافیت پر اپنی رپورٹ بھی شائع کر چکا ہے۔ بہرحال موجودہ قومی اسمبلی میں مسلم لیگ (ن) کو اب سادہ اکثریت مل چکی ہے۔ میاں صاحب کے یہ رسک لینے پر مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ ان کے انتہائی پسندیدہ صحافی ابصار عالم نے اندر کی بات بتاتے ہوئے کہا کہ ’’بڑوں‘‘ نے سول حکومت کو طعنہ دیا تھا کہ نہ وہ کوئی بیانیہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے‘ نہ کسی بھی سمت سے ملکی حالات میں بہتری آئی ہے‘ نہ وہ قیدی نمبر ۸۰۴ کی مقبولیت ختم کر سکی۔ پھر یہ کہ NDU سے خطاب کرتے ہوئے فیلڈ مارشل نے سیاست دانوں کو بے نقط سنائی تھیں‘ جس کے جواب میں حکومت نے کہا کہ وزیرخزانہ آپ کا‘ وزیر داخلہ آپ کا جو کہ حکومت کی اہم ترین وزارتیں ہیں‘ پھر یہ ناکامی کس کی ہے!

راقم کی رائے میں میاں صاحب پھر بھی اسٹیبلشمنٹ کے بارے میں وہ کچھ نہ کہتے جو کچھ انہوں نے کہہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیلڈ مارشل کے انتہائی مضبوط ہونے بلکہ پاکستان میں آل اِن آل اور تمام اختیارات کا حامل ہونے کے باوجود آنے والے دِنوں میں اُن کی ملازمت کے دن پورے ہو رہے تھے اور یہ اختیار ظاہری طور پر وزیراعظم شہباز شریف اور اصلاً میاں نواز شریف کے پاس ہے کہ وہ اُن کی ملازمت میں ایکسٹینشن کر کے اُنہیں ۲۷ ویں ترمیم سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔ میاں صاحب نے اِس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کا طے کیا۔ چنانچہ راقم نے یہ موقف اختیار کیا کہ میاں نواز شریف فیلڈ مارشل کی ایکسٹینشن کے راستے میں کوئی رکاوٹ ضرور ڈالیں گے۔ اس پر پاکستان ہی نہیں‘ دنیا بھر کے تبصرہ نگاروں نے راقم کا تمسخر اُڑایا۔ سب کی مشترکہ اور متفقہ رائے تھی کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

راقم کا موقف یہ تھا کہ میاں صاحب اتنی جرأت کا مظاہرہ تو لازماً کریں گے کہ بڑوں کی خواہش کے مطابق فوری طور پر نوٹیفکیشن جاری نہ کریں بلکہ لیت ولعل سے کام لیں‘ جبکہ ’’بڑے‘‘ اس معاملے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس کی ایک بڑی مثال یوں سامنے آئی

کہ پارلیمنٹ میں جب ۲۷ ویں ترمیم منظور ہو رہی تھی تو سینیٹر عرفان صدیقی وفات پا گئے۔ وہ میاں نواز شریف کے انتہائی قریبی ساتھی تھے‘ اور ان کی اہم تقاریر اکثر وہی لکھتے تھے۔ اُن کی موت کی خبر میڈیا سے ایک دن کے لیے چھپائی گئی کیونکہ کسی رکن کی موت سے پارلیمنٹ میں ایک دن تعطیل کرنا پڑتی ہے۔ گویا اگلے مرحلہ کی طرف بڑھنے میں ایک دن کی تاخیر ہو جاتی۔ اِسی لیے تمام مراحل اتنی تیزی سے طے کیے جا رہے تھے کہ وقت بالکل ضائع نہ ہو اور ۲۷ نومبر تک آئینی ضروریات کو کسی نہ کسی طرح مکمل کر کے نوٹیفکیشن جاری کروا لیا جائے۔ پھر ہوا یوں کہ ۲۵ نومبر کو وزیر اعظم جنہوں نے نوٹیفکیشن پر دستخط کرنا تھے‘ بیرونِ ملک روانہ ہو گئے۔ وزیر دفاع خواجہ آصف جنہوں نے اپنی سفارش کے ساتھ فائل وزیر اعظم کو بھجوائی تھی‘ وہ جرمنی روانہ ہو گئے۔ اس پر ملک بھر میں خبروں اور افواہوں کا طوفان اُٹھ گیا۔ حکومت کئی جھوٹی سچی توجیہات پیش کرتی رہی‘ لیکن سوشل میڈیا پر اُٹھنے والا طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ نواز شریف نے یہ اور وہ شرائط رکھ دی ہیں جن کی تکمیل کے بغیر نوٹیفکیشن جاری نہیں ہوگا۔

سوشل میڈیا کے مطابق حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ اسٹیبلشمنٹ نے حکومت کو dead line دے دی کہ اس وقت تک نوٹیفکیشن جاری کرنا ہوگا۔ پھر بھی ایسا ظاہر کیا جا رہا تھا کہ شاید نواز شریف یہ جنگ جیت جائیں گے اور کوئی نئے جنرل آرمی چیف مقرر ہو جائیں گے۔ پھر یکدم یہ خبر آئی کہ وزیر اعظم نے موجودہ آرمی چیف کی پہلے CDF کے طور پر تقرری کی منظوری دے دی ہے اور فائل دستخطوں کے لیے صدر کو بھیج دی ہے۔ اب بحث یہ ہو گئی کہ نواز شریف نے چند روز پہلے اسٹیبلشمنٹ کے خلاف جو بیان دیا تھا‘ اس کی اب کیا حیثیت رہ گئی ہے! نواز شریف ایسا بیان دینے کے بعد یوں بُری طرح پسپا کیوں ہو گئے ہیں؟ اپنے اصولی موقف پر وہ سٹینڈ کیوں نہیں لے سکے؟ سوشل میڈیا اُس کی دو وجوہات بتا رہا ہے۔ ایک یہ کہ طاقتوروں کے خلاف سٹینڈ لینے کے لیے اُجلے کردار کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے دامن پر لگے کرپشن اور دوسری بے ضابطگیوں کے الزامات کی وجہ سے بعد میں جھکنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امریکہ کو آنے والے دنوں میں پاکستان سے کچھ انتہائی

ضروری معاملات طے کرنے ہیں۔ اس نے ہمیشہ یہ خواہش کی ہے کہ پاکستان میں وہ ایک ہی شخصیت سے معاملات طے کرے جو آئرن مین ہو‘ جس کے پاس مکمل اختیارات ہوں اور جسے لمبی چوڑی مشاورت‘ پارلیمانی منظوریوں اور عدالتی کارروائیوں کی ضرورت نہ پڑے۔ لہٰذا نواز شریف کی پسپائی درحقیقت امریکی احکامات کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم! یہ اگرچہ ایک قیاس آرائی ہے لیکن غیر منطقی نہیں اور اس کا پس منظر ماضی قریب کے چند حقائق ہیں۔

۲۰۲۳ء میں جب امریکہ کے صدر جو بائیڈن تھے تو اسرائیل کو تسلیم کروانے کے لیے ایک مہم کا آغاز ہوا۔ اُن ہی دنوں میں راقم نے اس امریکی مہم کا ذکر ایک دوسرے جریدے میں اپنی تحریر میں کیا تھا کہ امریکہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے سعودی عرب کو راضی کر چکا ہے یا اس کے قریب ہے۔ اسرائیل کو بھی اس حوالے سے اعتماد میں لے لیا گیا ہے اور معاملات اُن کے نقطۂ نظر کے مطابق مثبت انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس حد تک ہمارے خیالات اور موقف کی تصدیق دسمبر ۲۰۲۵ء میں اسرائیل کے اخبار نے بھی کر دی ہے کہ ۲۰۲۳ء میں عربوں کے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات قریباً طے ہو چکی تھی اور معاملات کو آخری شکل دی جا رہی تھی کہ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس نے اسرائیل پر حملہ کر دیا اور سارا پلان چوپٹ ہو گیا۔ البتہ راقم نے اپنی جس تحریر کا ذکر کیا ہے‘ اُس میں یہ بات شامل تھی کہ پاکستان بھی اس پلان کا حصہ بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس لندن پلان کا ذکر مسلسل سننے میں آتا تھا‘ اُس کے خدوخال یہ تھے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں سعودی عرب کو اُس وقت بڑی سہولت ہوگی اگر اسلامی دنیا کا واحد ایٹمی ملک پاکستان بھی اسرائیل کو تسلیم کر لے۔ بائیڈن کا مکمل پلان یہ تھا کہ پاکستان کو بھی اس پلان میں شامل کیا جائے۔ لہٰذا اُس وقت کی اسٹیبلشمنٹ پر بھی امریکی دباؤ آیا۔ مشہور و معروف صحافی حامد میر کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی گواہ ہیں کہ ریٹائرڈ آرمی چیف جنرل باجوہ وزیر اعظم عمران خان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اسرائیل کو تسلیم کیا جائے‘ لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ لہٰذا اُس وقت کی اپوزیشن سے مل کر اُنہوں نے عمران خان کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا۔ وہ مشہور و معروف سائفر بھی اس خبر کی تصدیق کرتا ہے جو اُس وقت امریکا میں پاکستانی سفیر کے ذریعے دنیا کے سامنے آیا تھا۔ اب غزہ میں دو سال کی ہلاکت انگیزی اور بدترین خوں ریزی

کے بعد امریکہ اور اسرائیل دوبارہ اس پوزیشن پر آ چکے ہیں کہ عرب ریاستوں سمیت مسلمان ممالک سے مطالبہ کر سکیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں۔ اگرچہ سعودی عرب اور پاکستان دونوں نے اب بھی یہ مطالبہ سامنے رکھا ہے کہ جیسی کیسی بھی ہو' فلسطین نام کی ایک ریاست ضرور ہونی چاہیے لیکن امریکہ اور اسرائیل کا اب وہی انداز ہے جو فاتحین کا ہوتا ہے۔ اسرائیل کی کابینہ نے واضح کر دیا ہے کہ فلسطین نام کی کسی ریاست کا قیام اُنہیں منظور نہیں ہے اور اس خطہ زمین پر صرف ایک ہی ریاست ہوگی اور وہ اسرائیل ہوگا۔ ٹرمپ کے ۲۰ نکات میں بھی فلسطینی ریاست کا مہمل سا ذکر ہے' جس سے انکار ان قوتوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ پاکستان سلامتی کونسل کے غیر مستقل رکن کی حیثیت سے ٹرمپ کے ۲۰ نکات پر مشتمل قرارداد کے حق میں ووٹ دے چکا ہے۔ اب اس پالیسی کے پاکستان میں نفاذ اور تسلسل کے لیے یہاں ایک آئرن مین کی ضرورت ہے جو ایک سخت اور طاقتور ریاست قائم کر کے مطلوبہ ایجنڈے کی تکمیل کر سکے۔ یہ عوامی حمایت سے محروم کسی سیاسی حکومت کے بس کی بات نہیں' لہٰذا یہ کام اس کے سپرد نہیں کیا جا سکتا' البتہ سیاسی جماعت کو شوپیس کے طور پر برداشت یا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

راقم کے نزدیک طاقت کے بل بوتے پر یہ کام وقتی طور پر تو ہو جائے گا لیکن عرب کے عوام اور نہ ہی پاکستانیوں کی عظیم اکثریت اس کو اپنے حلق سے نیچے اتار سکے گی۔ اس بات کے واضح امکانات ہیں کہ ایک طرف حماس کی قیادت میں عرب عوام مزاحمت کریں اور دوسری طرف پاکستان کے عوام حکومت مخالف سیاسی جماعتوں خاص طور پر مذہبی جماعتوں کی قیادت میں بھرپور احتجاج کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی پاپولر عوامی لیڈر یا سیاسی جماعت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی پالیسی کی حمایت کر کے عوام میں زندہ رہ سکے۔

قارئین کو اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ آخر کیوں پاکستان کی اٹھتر سالہ تاریخ میں انتہائی مقبولیت کے حامل عوامی لیڈر اپنی سوچ' فکر اور عمل کو وقت کی اسٹیبلشمنٹ سے ہم آہنگ نہ کر سکے اور راندۂ درگاہ ہوئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن' ذوالفقار علی بھٹو' نواز شریف اور عمران خان اس کی واضح مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باہمی تصادم سے ملک سیاسی' سماجی اور معاشی لحاظ سے ترقی معکوس اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ عوام میں بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی

صورتِ حال اس وقت وطن عزیز کو شکنجے میں لیے ہوئے ہے۔ تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ تصادم کے نتیجہ میں سامنے آنے والی سیاسی بے چینی اور بے یقینی کسی طرح بھی ۱۹۷۱ء کے بحران سے کم نہیں۔ اللہ رب العزت پاکستان کو محفوظ رکھے' آمین! ۱۹۷۱ء کے بحران کی وجہ سے مشرقی پاکستان اس لیے بنگلہ دیش بن گیا کیونکہ ملک کے دونوں حصوں میں جغرافیائی دوری تھی اور درمیان میں بھارت جیسا دشمن ملک تھا' ملک کی سلامتی میں بہت مشکلات درپیش تھیں لیکن کوئی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا عوامی لیگ کو دیا ہوا مینڈیٹ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ بنگالی عوام کی اکثریت اور ان کے لیڈر سے طاقتوروں کے راستے جدا نہ ہوتے تو یہ علیحدگی ہرگز ممکن نہ تھی۔

اس بات پر غور نہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ۱۹۷۱ء میں عملی طور پر صرف بھارت پاکستان سے برسرِ پیکار تھا۔ درحقیقت روس کی مکمل اور امریکہ کی جزوی حمایت اسے حاصل تھی۔ چین کا شمار اس وقت سپر طاقتوں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود چین نے پاکستان کو ایک انتہائی صائب مشورہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے خلاف طاقت استعمال نہ کی جائے بلکہ عوامی لیگ کے ساتھ افہام و تفہیم اور مفاہمت کا معاملہ کیا جائے۔ شنید ہے کہ اس پر صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے چین کو جواب دیا تھا I thought you were friend دروغ برگردنِ راوی۔ بہرحال عوامی مینڈیٹ کو تسلیم نہ کرنے کا نتیجہ پاکستان کی شکست و ریخت کی صورت میں نکلا۔

پاکستان کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ تحریک انصاف کے عوامی مینڈیٹ کو تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ مرکز اور تین صوبوں میں قائم حکومتوں کو فارم ۴۷ کی حکومتیں کہا جا رہا ہے۔ خیبر پختونخواہ میں تحریک انصاف کی زبردست اکثریت تھی۔ تحریک انصاف کے سربراہ کو قریباً تین سال سے قید کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف اڑھائی' تین سو کے قریب مقدمات درج کر دیے گئے لیکن کسی ایک مقدمہ میں بھی جان نہیں ہے۔ لہٰذا دہشت گردی کے مقدمات سے متعلق خود ساختہ عدالتوں سے اسے سزائیں سنا دی گئی ہیں۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ آج صرف بھارت پاکستان کا دشمن نہیں ہے بلکہ واحد اسلامی ایٹمی قوت ہونے کی وجہ سے چین کے سوا تمام بڑی

طاقتیں پاکستان پر ٹوٹ پڑنے کو تیار ہیں۔ روس اگرچہ نیوٹرل نظر آ رہا ہے لیکن امریکہ جو اسرائیل کو کھلاتا پلاتا ہے اور اس کے دفاع کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے‘ وہ پاکستان کو اسرائیل کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ امریکہ جو پاکستان کا دوست نما بدترین دشمن ہے‘ اسے خوش کرنے کے لیے ہم افغانستان سے اپنے تعلقات بدترین سطح پر لے آئے ہیں۔ اگرچہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی‘ اور افغان حکومت بھی ان دنوں اُلٹے سیدھے اقدامات کر رہی ہے لیکن پاکستان کے لیے سوچنے کا معاملہ یہ ہے کہ آپ افغانستان سے ملحقہ اپنے صوبہ میں عوامی مینڈیٹ کو تسلیم نہ کر کے جھگڑا کھڑا کر لیں گے تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہاں کے عوام اگر ریاست کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے تو نتائج کا ذمہ دار کون ہو گا! یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کے پی کے کے عوامی مینڈیٹ کو قبول کر کے افہام و تفہیم میں پاکستان کا تحفظ یقینی ہوتا ہے یا ایک دوسرے کو ذہنی مریض کہہ کر اور سکیورٹی رسک قرار دے کر سیاسی عدم استحکام پیدا کر کے! اس وقت باہمی عدم اعتماد اور نفرت کی جس آگ میں ملک جل رہا ہے وہ نہ جیل سے سخت ترین اور خطرناک ٹویٹ کر کے بجھے گی اور نہ دسمبر کی قہر آلود راتوں میں اپنے لیڈر سے ملاقات کے خواہش مند دیوانوں پر یخ بستہ پانی برسا کر۔ hard state کا تصور اور اس پر عمل درآمد کی کوشش وقتی طور پر تو اسے مدھم کر سکتی ہے لیکن یہ چنگاری کسی وقت بھی شعلہ جوالا بن کر ہماری سلامتی کو بری طرح جھلس دے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایک متحد قوم بن کر اُمّتِ مُسلمہ کو اسلام دشمن قوتوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے اہم اور کلیدی رول ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آیئے اس کا آغاز یوں کریں کہ خود احتسابی کا سلسلہ شروع کریں۔ دوسروں کے عیب نظر انداز کر کے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں‘ اپنی اصلاح کریں‘ تب ہی معاشرے کی اصلاح ہو سکے گی۔ جب ایک صالح معاشرہ وجود میں آ جائے گا تو ملک میں اللہ کا دین نافذ کر کے اُمّتِ مُسلمہ کا سنہرا ماضی حال میں تبدیل کرنے کی سعی و جہد کے لیے راستہ ہموار ہو جائے گا۔ سچ یہ ہے کہ یہی تصورِ اقبال تھا اور قائداعظم کی عملی جِدّ و جُہد کا ہدف بھی یہی تھا۔ یہی ہماری دنیوی اور اخروی نجات کا واحد راستہ ہے کہ ہم خود احتسابی سے سفر کا آغاز کرتے ہوئے پاکستان کو صحیح معنوں میں دینِ متین کا گہوارہ بنا دیں۔ ❁❁

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

حقوق و فرائض پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے‘ لیکن جب تک عملاً اور ذہناً یہ قبول نہیں کیا جائے گا کہ حقوق و فرائض کا تعین اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے ﴿وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝۷﴾ (الرحمٰن) اُس وقت تک افراد‘ خاندان اور حکومتی ادارے تک افراط و تفریط کا شکار ہوتے رہیں گے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ میزان بھی نازل کی ہے تاکہ لوگ نظامِ عدل و قسط پر قائم ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندانی نظام پر بھی انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے‘ ورنہ تو بقول صائب تبریزی ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

انقلاب ہمیشہ فردِ واحد کی زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ بندگیٔ ربّ‘ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جِدّ و جہد کا پہلا میدان ایک انسان خود اور اس کا گھر ہے۔ ہم جب تک اجتماعیت ہی پر توجہ رکھیں گے‘ حقوق و فرائض سے نظریں چرائیں گے اور ع: ”کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی“ کے مصداق گھر میں عملاً غیر عادلانہ رویے اپنائیں گے تو ہم ایک اچھے اور کامیاب انسان بھی نہیں بن سکتے۔ ع ”ایں خیال است و محال است و جنوں!“

اقامتِ دین کا اولین مرحلہ تو انقلابی ذہن تیار کرنا ہے۔ بقول جگر مراد آبادی ع ”جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!“ دل و دماغ پر انقلاب لانے کے لیے پیار محبت‘ ایثار و قربانی‘ عفو و درگزر‘ اپنے گھر والوں کی کڑوی کسیلی باتیں صبر سے سننا‘ تحمل سے ان کو دینی اور دُنیوی ذمہ داریوں کا شعور دلانا‘ انتہائی ضروری ہے۔ اسی کو Passive Resistance کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پیارے رسول ﷺ کی تعریف میں فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ

لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ ﴾ (آل عمران:۱۵۹) ''اللہ کی کتنی رحمت ہے کہ آپ ان کے ساتھ بہت نرم دل ہیں' اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے ہٹ جاتے۔''

خاندانی نظام میں مَردوں کو عدل وقسط کی میزان کو مضبوطی سے پکڑنا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے پر معاملات میں توازن رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ ایک حدیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں نے ظاہری چیزوں میں پورا پورا عدل کیا ہے' باقی جہاں تک میرے دل کے میلان کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے کہ اس بارے میں تُو مجھ سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

مَردوں کو بحیثیت بیٹا کیسا ہونا چاہیے؟ یہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات (۲۳ و مابعد) سے بہت اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ رفقاءِ تنظیم نے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں ان آیات کا درس تو بہت اچھی طرح سنا ہوگا۔ عملاً والدین کے ساتھ ہمارا رویہ' اخلاق اور عمل کیسا ہونا چاہیے' اس کے لیے ان آیات کے الفاظ کو مدّ ِنظر رکھتے ہوئے جو ممکنہ فرائض بیٹے پر عائد ہوتے ہیں ان کی تشریح کی کوشش کی جائے گی۔

بیٹے کے عمومی فرائض اور والدین کے حقوق

i) ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا (سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیات کا مطالعہ کرنا اور ان پر غور وفکر کرنا کہ یہ مَردوں کی لازمی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔)

ii) ان کے ساتھ مناسب وقت گزارنا۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ کھانا بھی کھانا۔ ضرورت پڑنے پر ان کے ساتھ سونا (والدین کی خواہش کے مطابق بھی اور ان کی ضرورت کے مطابق' لیکن اعتدال اور عدل کے ساتھ)

iii) اپنی حیثیت کے مطابق والدین پر خرچ کرنا

iv) ضرورت پڑنے پر والدین کی خدمت کرنا۔ اپنے بیوی بچوں کو کہنے کے بجائے خود اس امر پر توجہ دینا اور اللہ کا شکر ادا کرنا کہ جنت اُس کی اپنی والدہ کے قدموں تلے ہے۔ ان کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھنا۔ ع ''یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا!''

v) بیوی کو والدین کی خدمت پر ہرگز مجبور نہ کرنا

شادی شدہ بیٹوں کی ذمہ داریاں

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ....﴾ (النساء:۳۴)

''مَرد عورتوں پر حاکم ہیں.......''

خاندان کے ادارے میں اللہ تعالیٰ نے مَردوں کو قوام بنایا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران:۱۸) کہ وہ عدل وانصاف پر قائم ہے۔ سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۸)۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾۔ (آیت ۱۳۵) جو ذاتِ باری تعالیٰ خود انصاف پر قائم ہے وہ ہم اہلِ ایمان سے بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انصاف پر قائم ہو جاؤ' اللہ کے حق میں گواہی دینے والے۔ خاص طور پر مَردوں کو علیحدہ سے یہ منصب عطا کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔

ہمارا المیہ ہے کہ ہم اولاد کو دنیاوی علوم میں ہی ڈگریاں دلواتے رہ جاتے ہیں۔ صرف ایک خاندان کے حقوق وفرائض بھی نہ خود ہمارے ہاں عمل میں ہیں نہ ہم اولاد کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عبادات میں تو ہم سبقت لے جانے بلکہ عزیمت کی باتیں کرتے ہیں لیکن معاملات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

یہاں صرف بیٹوں کے فرائض کی بات ہوگی جو شادی کے بعد ان پر والدین کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ گویا من جانب اللہ یہ والدین کے حقوق یعنی بیٹوں کے فرائض ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ واحد مذکر کے صیغے میں یہ بات بیوی کو بھی لازم آتی ہے' لیکن قصہ آدم وابلیس میں اللہ تعالیٰ نے مسلسل ''هُمَا'' کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ سات مقامات پر آیا ہے لیکن ایک مرتبہ بھی صرف مذکر کے صیغے سے خطاب نہیں کیا گیا' جبکہ یہاں مسلسل واحد مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ مثلاً: عِنْدَكَ، لَا تَقُلْ، لَا تَنْهَرْ، قُلْ، وَاخْفِضْ۔

(۱) والدین کا معروف حکم ماننا فرض ہے۔

(۲) والدین کی خدمت (اگر انہیں ضرورت ہے تو) بیٹوں کا فرض ہے۔ اس ضمن میں حدیث مبارکہ بھی ہے کہ بیٹے کو والدین کی وجہ سے حج اور جہاد پر جانے سے روکا گیا۔ (علاوہ ازیں

والدین خوشی سے اجازت دے دیں‘ یا پھر بیٹے ایک سے زیادہ ہوں تو جسمانی اور مالی خدمت بانٹی جاسکتی ہے۔)

(۳) یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے قلم یا زبان بیٹوں کے فرائض بتاتے ہوئے جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ مَرد/ بیٹے کو اپنے معاش کے لیے بھی والدین سے دور ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ یقین جانیں کہ حلال اور محنت کی کمائی میں برکت ڈالنے والی چیز والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور وہ بہترین دعائیں ہیں جو والدین اولاد کے حق میں کرتے ہیں۔ چنانچہ کوئی موچی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ہمسایہ بن جاتا ہے اور کسی لکڑہارے بیٹے کی اپنے والدین کی مثالی خدمت پر غاروں کے دہانے سے پتھر ہٹ جاتے ہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔

(۴) سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے حقوق کے ضمن میں آیات کو پڑھتے ہوئے شدید احساس ہوتا ہے کہ ہماری تنظیم کو بھی اس ضمن میں ایسے اصول بنانے اور اپنانے بہت ضروری ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات کا مطالعہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ﴾

’’اور تمہارے ربّ نے یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔‘‘

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے کیا مراد ہے‘ اس کی تشریح اگلی آیات میں آ رہی ہے:
﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾ (واحد مذکر مخاطب کے صیغے میں والدین کے حقوق بیٹے کو سمجھائے جا رہے ہیں کہ) ’’ان دونوں (والدین) میں سے اگر ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہیں کہنا‘‘ (جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ ’’اُف تم نے یہ کیا کر دیا‘‘)۔ والدین بھی انسان ہیں‘ ان سے بھی غلطی ہوسکتی ہے تو بیٹے نے پیار ومحبت سے سمجھانا ہے۔ ہم اُف کا ترجمہ صرف اردو والا ’’اُف‘‘ ہی کریں گے لیکن اگر عربی لغت میں دیکھیں تو اس لفظ میں اور بھی بہت سی قباحتیں موجود ہیں۔

﴿وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ ’’اور نہ ہی ان کو ڈانٹنا ہے۔‘‘ والدین تو کیا‘ ہمیں تو ملازمین اور اپنے

ماتحت افراد کو بھی ڈانٹنے سے منع کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے غلام حضرت زیدؓ کو کبھی نہیں ڈانٹا حالانکہ وہ چھوٹی سی عمر میں آپ ﷺ کے پاس آ گئے تھے اور اس عمر میں تو بچے بہت غلطیاں کر لیتے ہیں‘ لیکن آپؐ غلاموں کے حق میں بہت شفیق تھے۔

اولاد بالعموم اپنے والدین کے ساتھ زیادتی‘ نافرمانی‘ تحقیر اور بداخلاقی سے پیش آتی ہے جبھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص ہدایات دی جا رہی ہیں۔ جتنا ہوسکتا ہے‘ خود ان کے ساتھ بھلائی بلکہ احسان کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ والدین کے ساتھ سختی کا رویہ اپنانے سے گریز کریں بلکہ ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اسی طرح ان کی جائز خواہشات کو احسن طریقے سے پورا کریں۔ اگر بڑھاپے میں ارذل العمر کی وجہ سے وہ کوئی ناجائز یا غلط بات بھی کر لیتے ہیں تو اسے نظرانداز کر دینا‘ عفوودرگزر کرنا اور پیار سے سمجھانا ضروری ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے کہی ہے کہ ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾۔

﴿وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳﴾ نرمی اور ملائمت سے اُن کی عزّتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے بات کی جائے۔ اپنے والدین کی خدمت کو جنت کی کنجی سمجھتے ہوئے انہیں کسی اور کے حوالے نہ کریں۔ بیٹے کی جنت اس کی والدہ کے قدموں میں ہے۔ ایک بیٹے کا اپنے ماں باپ کے کھانے‘ لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھنا ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ بیٹے کے لیے جنت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ اپنے بچوں کی وجہ سے کسی پریشانی یا بیوی کے سخت رویہ کا غصہ والدین پر نہ نکالیں۔ بیوی‘ بچے والدین کی خدمت میں مددگار ہوں تو فبہا‘ لیکن اصل ذمہ داری بیٹے پر ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو حرزِ جان بنائے۔ بڑھاپے میں والدین کو بوجھ سمجھنے کی بجائے قرآن تو ہمیں ’’احسان‘‘ کا رویہ اپنانے کا کہہ رہا ہے۔ ’’بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا‘‘ کے الفاظ قرآن میں چار مرتبہ والدین کے حق میں آئے ہیں۔ لفظ ’’اِحْسَانًا‘‘ کو سمجھنے کی کوشش کریں: بڑھاپے میں ان کے سخت رویے‘ اولاد کو برا بھلا کہنا‘ کسی بات پر ضد کر کے بیٹھ جانا یا کسی بھی ناگوار لہجے یا رویے کے باوجود والدین کے اس طرزِ عمل سے صرفِ نظر کرنا‘ بلکہ ردِّعمل کے طور پر ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔

بیٹا اگر خود تھکا ہوا ہے‘ بے آرام ہے‘ یا باہر سے ابھی گھر آیا ہے اور والدین کی طرف سے کوئی جائز مطالبہ پیش آ جائے تو ان کے لیے تیوری نہیں چڑھانی‘ غصہ نہیں لانا‘ منہ نہیں بسورنا‘

ماتھے پر بل نہیں لانے۔ ان کے ساتھ احسن طریقے سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اگر کام فوری نوعیت کا ہو تو سعادت مندی سے کر دینا چاہیے‘ ورنہ نرمی سے ان کو کسی اور وقت کا کہہ دینا چاہیے۔ اپنے والدین کو کوئی فالتو چیز سمجھ کر ان سے اعراض اور چشم پوشی نہ کریں۔

﴿وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ﴾ نوٹ کریں یہاں بھی واحد مذکر کے صیغے میں بیٹے کو بتایا جا رہا ہے کہ اصل میں تمہاری ذمہ داری ہے کہ اپنے والدین کے سامنے عاجزی سے کندھے جھکا کر رکھو۔ یہ ہماری تہذیب کا المیہ ہے کہ بیٹا اپنے والدین کے سامنے بھی عاجزی کا رویہ نہیں رکھتا‘ بیوی کے والدین کے سامنے تو کیا ہی کہنا ہے۔ مزید یہ کہ والدین نے اگر اپنے بیٹے کو بھی ڈانٹنا ہو تو بہو کو ہی ڈانٹتے ہیں۔ بیٹا اپنے والدین کی ضروریات کا خیال خود رکھے۔ یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع میں والدین کے حق میں اولاد کو جو ہدایات اور ذمہ داریاں دی جا رہی ہیں وہ والدین کے بڑھاپے کی صورت میں ہیں۔ جوانی کی صورت میں تو والدین عام طور پر خود کفیل ہوتے ہیں۔ احسن صورت یہی ہے کہ جب تک ہو سکتا ہے‘ وہ اپنا بوجھ خود ہی اٹھائیں۔ اپنا کام خود کریں‘ بیٹوں پر اضافی بوجھ نہ ڈالیں۔ بیٹوں کی اپنی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ معاش کی ذمہ داری‘ اپنے بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری ان پر ہے۔ بہت سے والدین تو بڑھاپے میں اپنی ذمہ داریاں اٹھانے کے ساتھ اپنی دوسری نسل کی دیکھ بھال میں بھی حصہ لیتے ہیں اور یوں اپنے بیٹوں کے دست و بازو بنتے ہیں۔ اس اعتبار سے والدین اپنی اولاد کے لیے اس عمر میں بھی ’’رحمت‘‘ ہوتے ہیں۔ شاید اسی موقع کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا نقل کی گئی ہے:

﴿وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾﴾ (الشعراء)

’’اور میرے لیے بنا دے سچی ناموری پچھلے لوگوں میں۔‘‘

اس مقام پر بڑھاپے میں نرمی کے ساتھ والدین کے سامنے بیٹے کو کندھے جھکانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مزید بیٹے کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ خود اپنے والدین کی آواز پر لبیک کہے نہ کہ بیوی کو کچھ کہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیٹا خود تو موبائل میں مصروف رہے یا تھکاوٹ کا کہہ کر بستر پر دراز ہو اور بیوی گھریلو کام کاج کے ساتھ والدین پر بھی توجہ دے۔ خدا کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو

ادا کریں‘ ورنہ قیامت کے دن آپ کو نہ صرف فرائض میں غفلت کی سزا ملے گی بلکہ فرسودہ روایات کے مطابق اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کے بھی ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ آج تو بیوی محکوم ہے اور آپ کی ملکیت ہے لیکن قیامت کے دن وہ آزاد ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَیۡئًا ؕ﴾ (الانبیاء:۴۷)

’’پھر کسی جان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

ہمیں چاہیے کہ ہم خود بھی سمجھیں اور اپنی نسلوں کو بھی ان کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے بتائیں‘ کیونکہ آگے ہمارا رب ہماری اولاد سے یہ بھی فرما رہا ہے:

﴿وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا ﴿۲۴﴾﴾

’’اور کہو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسے کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔‘‘

والدین کی خدمت: بیٹے کی ذمہ داری‘ نہ کہ بہو کی

’’رَبَّیٰنِیۡ‘‘ کا لفظ واضح کر رہا ہے کہ ان دونوں (والدین) نے میری پرورش کی۔ یعنی پرورش تو بیٹے کی کی‘ نہ کہ بہو کی۔ ہمارے معاشرے میں بہوؤں کے لیے ناجائز ذمہ داریاں ایسی رچی بسی ہوئی ہیں کہ دین دار طبقہ بھی یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ ساس سسر کی خدمت کرنا بہوؤں کی ذمہ داری ہے۔ ان غلط نظریات کو ختم کرنا اگرچہ آسان نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ معاشرے کی پہلی اینٹ خاندان ہی ہوتا ہے۔ یہی خاندان اگر فتنہ وفساد اور افراط و تفریط کا شکار رہے تو اس کو کون ٹھیک کرے گا۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ خاندان میں حقوق و فرائض کا معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام سے کوئی تعلق نہیں ہے‘ جبکہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ پہلے تو علماء کرام کو بھی اس کا کوئی حل نہیں ملتا تھا کہ ساس بہو‘ نند بھاوج کے جھگڑے کو کیسے ختم کیا جائے اور شوہر کو دو طرفہ میدانِ جنگ کا حصہ بننے سے دور کیسے رکھا جائے‘ لیکن اب کچھ علماء اس طور سے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ’’میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میری بیوی کو آپ نے کچھ نہیں کہنا‘ جو کہنا ہے مجھے کہیں۔ اس بات کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ دیر تو لگی لیکن پھر والدہ کو سمجھ میں آ گئی۔‘‘

اصل بات یہ ہے کہ اب اس جھگڑے کو ختم کیسے کیا جائے! ایک جوان بیٹا ہے جو شوہر بھی ہے اور اس کو قوام بنایا گیا ہے‘ تو درحقیقت وہی ان مسائل کو حل کر واسکتا ہے۔ وہ خود اپنے والدین کی خدمت کو فرض سمجھے۔ دل و جان سے اس بات پر راضی ہو۔ اپنی بیوی کو یہ احساس

ولائے کہ تمہارے اوپر میرے والدین کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے‘ بس تم نے مجھے روکنا نہیں۔ اگر میرے والدین کو رات کے وقت بھی میری ضرورت پڑی تو میں جاؤں گا‘ تم روکو گی نہیں۔ اگر روکو گی تو گناہ گار ہو گی۔ اس بات پر یقین رکھیں کہ بیوی کے سینے میں پتھر نہیں ہے۔ شوہر کا حسنِ سلوک اور عفو و درگزر رہے تو وہ بھی آگے بڑھ کر شوہر کے والدین کی خدمت کر سکتی ہے لیکن غصہ اور دھونس جمانا کہ میرے ماں باپ کی خدمت تمہارا فرض ہے‘ بالکل غلط ہے۔

مَرد کے حسن سلوک اور اچھے اخلاق کی وجہ سے بیوی خود شوق اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر شوہر کے والدین کی خدمت کرے تو نہ صرف اللہ سے اپنا اجر پائے گی بلکہ شوہر پر احسان کر کے اس کے شکریے کی بھی مستحق ہو گی۔ مَرد کو اللہ تعالیٰ نے اگر قوام بنایا ہے تو اس کے کچھ تقاضے بھی ہیں کہ وہ گھر میں عدل و انصاف کا بول بالا رکھے۔ جب تک والدین میں ہمت و طاقت ہے‘ ان کو اپنا گھر خود سنبھالنے دیں۔ البتہ کسی بھی قسم کی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر رہیں۔ جب وہ بیمار ہوں تو عملاً ان کی خدمت کریں اور ان کے حقوق کو پہچانیں۔ گھر آ کر صرف بیوی اور بچوں میں ہی مگن نہ رہیں کہ والدین انتظار کرتے رہ جائیں۔ والدین کی اپنی اولاد خصوصاً بیٹوں کے ساتھ ایسی محبت ہوتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاتی ہے۔ شادی کے بعد جب بیٹے کی محبت تقسیم ہو جاتی ہے تو وہ بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بیوی کے ساتھ والدین خصوصاً والدہ کو بھی احسن طریقے سے سمجھانے کی ضرورت ہے کہ میری بیوی اور اہل خانہ کا بھی مجھ پر حق ہے کہ ان کو وقت دوں۔ ان کے جائز مطالبات کو پورا کروں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھوں۔

ذہنی انقلاب کی ضرورت

گھر میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لیے ہمیں ذہنی انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔ ایک مَرد کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ استطاعت رکھی ہے کہ وہ والدین‘ بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کے درمیان توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ حق پر چلنے کے لیے مخالفتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بیٹے کو اپنے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی ضرورت ہے کہ میرے والدین نے مجھے پیدائش سے بچپن اور جوانی تک بے انتہا محنت و مشقت کر کے سنبھالا۔ یہاں تک کہ میں طاقتور ہو گیا اور وہ کمزور ہو گئے۔ اب جبکہ ان کو میری ضرورت ہے تو میں اپنے والدین کو کیوں کسی کے

حوالے کروں‘ خواہ وہ میری بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے ان کی خدمت کے عوض جنت ملے گی‘ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ میرے والدین کو جو راحت میری خدمت سے ملے گی وہ کسی اور سے نہیں مل سکتی۔

اپنے ماہانہ خرچ میں بھی عدل کے اصول کو قائم رکھیں۔ اہلِ خانہ کی ضروریات اور والدین کی ضروریات کے درمیان توازن قائم رکھیں۔ دونوں فریقین کی جائز ضروریات پوری ہونے کے بعد جو بچ جائے اس کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اوقات میں بھی اعتدال کرنا بہت ضروری ہے۔ گھر والوں اور والدین دونوں کو وقت دینا چاہیے۔ یہ سب کچھ آسان نہیں ہے۔ جنت کمانا اگر صرف عبادات سے ممکن ہوتا تو کافی آسان تھا۔ سورۃ العنکبوت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ ﴾

’’کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟‘‘

حقوق اللہ میں کمی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ باقی معاف کر دیں گے (ان شاء اللہ) لیکن حقوق العباد پورے نہ ہوئے تو خالص توبہ بھی قبول نہیں۔ ان کی معافی نہیں ہے۔ حقوق العباد میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں۔ مَرد اپنے اوپر یہ لازم کریں کہ والدین کے حقوق از روئے قرآن پورے کریں گے تو ہی ہمارے گھروں میں‘ ان شاء اللہ‘ انقلاب آئے گا۔

خواتین کے حقوق کی اہمیت

آخر میں ’’بیان القرآن‘‘ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۸ کی طویل تشریح میں سے یہ اقتباس پیش ہے جو خواتین کے حقوق کے ضمن میں ہے:

’’البتہ اس معاملے کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں بدقسمتی سے ہم مسلمانوں نے وہ بھی ان کو نہیں دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ابھی تک ہمارا ہندوانہ پس منظر مسلط ہے اور ہندوؤں کے معاشرے میں عورت کی قطعاً کوئی حیثیت ہی نہیں۔ وراثت کا حق تو بہت دُور کی بات ہے‘ اسے تو اپنے شوہر کی موت کے بعد زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ اسے تو شوہر کی چِتا کے ساتھ ہی جل

کرستی ہو جانا چاہیے۔ گویا اس کا تو کوئی قانونی وجود (legal entity) ہے ہی نہیں۔ ہمارے آباء و اَجداد مسلمان تو ہو گئے تھے‘ لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی تربیت نہیں ہو سکی تھی‘ لہٰذا ہمارے ذہنوں پر وہی ہندوانہ تصوّرات مسلّط ہیں کہ عورت تو مَرد کے پاؤں کی جوتی کی طرح ہے۔ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کہ ان کے جائز حقوق بھی ان کو نہیں دیتے‘ اس کے نتیجے میں ہم اپنے اوپر ہونے والی مغربی یلغار کو مؤثّر کرنے میں خود مدد دے رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی خواتین کو وہ حقوق نہیں دیں گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مقرر کیے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آزادیٔ نسواں‘ حقوقِ نِسواں اور مساواتِ مَرد و زن جیسے خوش نما عنوانات سے جو دعوت اُٹھی ہے وہ لازماً انہیں کھینچ کر لے جائے گی۔ لہٰذا اس طرف بھی دھیان رکھیے۔ ہمارے ہاں دین دار گھرانوں میں خاص طور پر عورتوں کے حقوق نظر انداز ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں عورتوں کے کیا حقوق ہیں اور ان کی کس قدر دل جوئی کرنی چاہیے۔‘‘

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمیں سنجیدگی سے حقوق و فرائض کے ضمن میں حقوق العباد پر عملاً توجہ دینی چاہیے۔ خواتین کو بھی ان کے جائز حقوق خوش دلی سے دیے جائیں۔ اس حوالے سے جب تک مَرد ہمت نہیں کریں گے‘ ہمارا معاشرہ جو ہندووانہ کلچر پر عمل پیرا ہے‘ اس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

ماھنامہ ”میثاق“ لاھور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

اسماء اللہ الحُسنیٰ (۲)

از پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۴۳) الحَقُّ

اللہ تعالیٰ الحَقُّ (سچا‘ حقیقی‘ حق دار)‘ وہ ذات ہے جو ہر صورت میں حق سچ ہے۔ جِنّ و اِنس سچّے بھی ہو سکتے ہیں اور باطل بھی‘ مگر پروردگار کی ذات ہی وہ واحد ذات ہے جو ہر صورت صرف حق سچ ہے۔ قرآن عظیم میں لفظ الحَقّ بہت زیادہ مستعمل ہے‘ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا مقصودِ اعظم حق ہی کی معرفت‘ دنیا میں حق پھیلانا‘ حق بولنا اور حق سکھانا ہے‘ یعنی کلام اللہ سراپا حق ہے اور منجانب ذاتِ حق ہے‘ حق کو ہی لے کر آیا ہے اور حق اس کے ساتھ ہے۔

لغت میں حق کے متعدد معنی ہیں:

(۱) راستی اور راست بازی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ﴾ (الکھف: ۲۹) ”اور آپؐ کہہ دیجیے کہ یہی حق ہے تمہارے ربّ کی طرف سے۔“ سورۂ لقمان میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ (آیت ۳۳) ”یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“ سورۃ النور میں ارشاد ہوا: ﴿يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾﴾ ”جس دن اللہ ان لوگوں کو پورا پورا دے گا ان کا واقعی بدلہ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے‘ کھول کر بیان کرنے والا۔“

(۲) کسی کام کا لازمی واقع ہونا۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ﴾ (آیت ۸) ”اور اُس روز وزن حق ہی میں ہوگا۔“ سورۃ النبا میں ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ”یہ دن حق ہے!“

(۳) کسی شخص کا معیّن حصّہ ہونا۔ سورۃ الذّاریات میں ارشاد ربّانی ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿١٩﴾﴾ ”اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا حق ہوا کرتا تھا۔“

(۴) عدل و انصاف کے ساتھ ہونا۔ سورۃ الجاثیۃ میں ارشاد ہے: ﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ

عَلَيۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسۡتَنۡسِخُ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ ''یہ ہمارا (تیار کردہ) اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر حق کے ساتھ گواہی دے گا۔ جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم اُسے لکھواتے جارہے تھے۔'' سورۂ صٓ میں ارشاد ہے: ﴿قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَ مِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اللہ نے فرمایا: تو حق یہ ہے' اور مَیں تو حق ہی کہتا ہوں کہ پھر مَیں بھی بھر کر رہوں گا جہنّم کو تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں گے۔'' سورۃ النساء میں ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ (آیت ۱۷۰) ''اے لوگو! تمہارے پاس آچکا ہے رسولؐ حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے۔'' سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَ بِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَ بِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''اور اِس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہی دینِ حق کا مالک ہے' اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی حق کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حق کے ساتھ فیصلے فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول حق پہنچاتے اور حق ہی بتلایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی حق کو نازل کرتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خلقت اور صنعت میں حق ہے' بطلان نہیں۔ صحیح بخاری کے مطابق حضور ﷺ کی تہجد کے وقت پڑھنے والی ایک جامع دعا کا ایک حصہ ہے: وَلَکَ الْحَمْدُ، اَنْتَ الْحَقُّ، وَوَعْدُکَ الْحَقُّ، وَلِقَاءُکَ حَقٌّ، وَقَوْلُکَ حَقٌّ، وَالْجَنَّةُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ، وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ، وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ، وَالسَّاعَةُ حَقٌّ ''اور (اے اللہ!) آپ کے لیے ہی حمد ہے' آپ حق سچ ہیں' اور آپ کا وعدہ سچا ہے' اور آپ کی زیارت/ ملاقات سچ ہے' اور آپ کی بات سچی ہے' اور بہشت حق سچ ہے' اور آگ (دوزخ) حق سچ ہے' اور تمام نبی حق سچ ہیں' اور محمد (ﷺ) حق سچ ہیں' اور قیامت حق سچ ہے۔''

(۵) مستحق اور حق دار ہونا۔ سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہے: ﴿فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔''

(۴۴) اَلۡوَكِيۡلُ

یہ اسم پاک وَکَلَ سے ہے جو ''بِ'' کے ساتھ بھروسا کرنے اور ''اِلٰی'' کے ساتھ کوئی معاملہ کسی کو سونپ کر بے فکر ہو جانے کے معنی میں آتا ہے۔ وَکیل بروزن فَعِیل ہے' اس وزن کے الفاظ بمعنی مفعول بھی آتے ہیں اور بمعنی فاعل بھی۔ جس انسان پر کوئی شخص اعتماد اور

وثوق کرتا ہے' اسے وکیل (اٹارنی) کہتے ہیں۔ الوکیل: اللہ تعالیٰ کا نام بمعنی فاعل ہے جس سے مراد حافظ' نگہبان اور کارساز ہے۔ الوکیل وہ ذات ہے جس کے سپرد تمام امور کیے جائیں اور وہ ان کو پورا کردے۔ پروردگار سے بڑھ کر کوئی ذات نہیں جو یہ تمام اُمور کماحقہٗ سرانجام دے سکے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا: ﴿وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔'' اللہ تعالیٰ وکیل ہے کہ جملہ امور میں درستی واصلاح اُسی سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ وکیل ہے کہ نظامِ عالم کا اعتماد اُسی کی ذاتِ مقدس پر ہے۔ اللہ تعالیٰ وکیل ہے کہ عاجز نوازی اور بندہ پروری اُسی کی شان ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيۡلًا ﴿۶۵﴾﴾ ''اور کافی ہے تیرا رب بطور کارساز۔'' سورۃ الانعام میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ وَّكِيۡلٌ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب! اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے' پس تم اُسی کی بندگی کرو' اور وہ ہر شے کا کارساز ہے۔'' سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا ﴿۹﴾﴾ ''وہ ربّ ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی' اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' بس آپ اُسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔''

توکّل (بھروسا کرنا) بھی اسی مادہ وکل سے بنا ہے۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر توکّل اور اہلِ توکّل کی مدح فرمائی گئی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ ''پھر جب آپ فیصلہ کرلیں تو اللہ پر توکّل کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' سورۂ یونس میں ارشاد ہوا: ﴿وَ قَالَ مُوۡسٰى يٰقَوۡمِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ فَعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِيۡنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''اور موسیٰؑ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو تو اب اُسی پر توکّل بھی کرو اگر تم واقعتاً فرمانبردار بن گئے ہو۔'' سورۃ الممتحنہ میں ارشاد ہوا: ﴿رَبَّنَا عَلَيۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَ اِلَيۡكَ اَنَبۡنَا وَ اِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۴﴾﴾ ''پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکّل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور ہمیں تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔'' سورۂ یوسف میں ارشاد ہے: ﴿اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ۚ وَ عَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی

کا ہے‘ اُسی پر میں نے توکّل کیا ہے‘ اور تمام توکّل کرنے والوں کو اُسی پر توکّل کرنا چاہیے۔’’ سورۃ الملک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلۡ هُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيۡهِ تَوَكَّلۡنَا ۚ﴾ (آیت ۲۹) ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے: وہ تو رحمٰن ہے‘ ہم اُس پر ایمان لا چکے ہیں اور اُسی پر ہمارا توکّل ہے۔’’ صحیح مسلم میں حضور اقدس ﷺ کی جامع دعا کا ایک حصہ ہے: ((اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ، وَبِکَ آمَنْتُ، وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ، وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ، وَبِکَ خَاصَمْتُ)) ’’اے اللہ! میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں‘ اور تجھ پر ایمان لاتا ہوں‘ اور تجھ پر اعتماد و بھروسا کرتا ہوں‘ اور تیری ہی جانب رجوع کرتا ہوں‘ اور تیرے لیے ہی مخاصمت کرتا ہوں۔’’

امام احمدؒ کے بقول توکّل تو قلب کا عمل ہے‘ یعنی یہ اعضاء یا زبان کا کام نہیں اور اس کا شمار مدرکات و معلومات میں بھی نہیں‘ بلکہ اس کا تعلق صرف دل سے ہے۔ ابن عطاء کا فرمانا ہے کہ توکّل تو یہ ہے کہ تیرے دل میں اسباب کی جانب میلان نہ پایا جائے‘ خواہ ان کی کتنی ہی ضرورت ہو۔ سلف کے توکّل کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے ترکِ اسباب کا نام توکّل رکھا ہے اور بعض نے اس کا مفہوم اسباب پر اعتماد کو ترک کرنا بتایا ہے۔ بہرحال توکّل کا اعلیٰ مرتبہ تو یہی ہے کہ اسباب کو تو ترک نہ کرے مگر اسباب پر اعتماد کو مکمل طور پر ترک کر دے۔ یاد رکھیں کہ توکّل کا بہترین درجہ توحید پر انحصار ہے اور توکّل کی حقیقت قلب کو جملہ علائق سے علیحدہ کر کے صرف توحید پر جم جانا ہے۔ اسباب کا تعلق جوارح کے ساتھ تو لگا رہے مگر اسباب کا تعلق قلب سے ذرا بھی نہ ہو۔ توحیدِ قلب سے توکّل ملتا ہے اور توکّل سے ہی توحیدِ قلب حاصل ہوتی ہے۔ ایک موحّد کی ہی یہ شان ہے کہ اس کے منہ سے ’’نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ‘‘ کا ورد جاری رہے۔

(۴۵) اَلْقَوِیُّ

اللہ عزوجل‘ اَلْقَوِیُّ (طاقت ور) ہے‘ جو ہر شے پر مکمل طور پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ اُس ذات کے پاس پوری کی پوری قوت ہے۔ اسی لیے وہ قوی ہے۔ یہ اسم پاک قوت سے ہے اور قوت کا استعمال قرآن کریم کے چند مقامات پر ہوا ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے کہ جب ذوالقرنین نے تیسرا سفر (جانبِ شمال) کیا تو ایک مقام پر وہاں کے باشندوں نے قوم یاجوج ماجوج کی لوٹ مار کی شکایت کی اور رکاوٹ کے طور پر ایک دیوار بنانے کے لیے کچھ خرچ وغیرہ دینا چاہا تو

ذوالقرنین نے نقدی لینے سے تو انکار کیا اور کہا: ﴿مَا مَكَّنِّيۡ فِيۡهِ رَبِّيۡ خَيۡرٌ فَاَعِيۡنُوۡنِيۡ بِقُوَّةٍ اَجۡعَلۡ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ رَدۡمًا ﴿۹۵﴾﴾ ’’جو کچھ مجھے دے رکھا ہے اس میں میرے ربّ نے وہ بہت بہتر ہے‘ البتہ تم لوگ میری مدد کرو قوت (محنت) کے ذریعے سے‘ مَیں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گا۔’’

مسلمانوں کو حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے اپنی بھرپور طاقت اور قوت تیار رکھیں۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ﴾ (آیت ۶۰) ’’اور تیار رکھو اُن کے (مقابلے کے) لیے اپنی استطاعت کی حد تک طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے۔’’ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الۡقَوِيُّ الۡعَزِيۡزُ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور وہ تو بہت قوی ہے‘ بہت زبردست ہے۔’’ سورۃ الذاریات میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِيۡنُ ﴿۵۸﴾﴾ ’’یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا‘ قوت والا‘ زبردست ہے۔’’ سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾ ’’یقیناً اللہ بہت قوت والا‘ بہت زبردست ہے۔’’

صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے قُوَّۃ کی تفسیر تیر اندازی سے فرمائی تھی۔ بعد میں مفسّرین نے اس کے تحت ہر دور کے جملہ جدید آلاتِ حرب مراد لیے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کی شرح میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول کے مطابق نیکی کرنے کی طاقت اور بدی سے بچنے کی قوت صرف اللہ تعالیٰ سے ہی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قوی ہے اور تمام قوتیں اُسی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قوی ہے‘ اُسی نے جملہ مظاہر کو قوتِ ربانی سے ظہور بخشا ہے۔ اللہ تعالیٰ قوی ہے اور اُسی کا نام ضعیفوں اور مسکینوں کے لیے توانائی بخشنے والا ہے۔ پروردگار ہی دل کو قوتِ ایمان بخشا اور روح کو قوتِ عرفان عطا کرتا ہے۔ ایک بڑی دل نشیں دعا ہے: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّنِیْ وَاِنِّیْ ذَلِیْلٌ فَاَعِزَّنِیْ وَاِنِّیْ فَقِیْرٌ فَارْزُقْنِیْ)) ’’یا اللہ! مَیں ضعیف ہوں‘ مجھے قوت عطا فرما‘ اور مَیں ذلیل و ناتواں ہوں‘ مجھے عزت عطا فرما‘ اور بے شک میں فقیر ہوں‘ پس مجھے رزق عطا فرما۔’’

(۴۶) اَلْمَتِیْنُ

پروردگار المتین (نہایت طاقت ور اور مضبوطی والا) ہے۔ مَتَنَ مَتَانَۃً: صَلُبَ وَاشْتَدَّ وَقَوِیَ۔ فاعل کے معنی میں متن اور متین آتے ہیں۔ اسم پاک متین کا مطلب یہ ہے

کہ وہ ذات قوی جسے اپنے افعال میں مشقت وکلفت اور تعب (تھکاوٹ) لاحق نہیں ہوتی۔ قوی اور متین میں تھوڑا سا فرق ہے۔ قدرت میں بالغ وتام کو قوی کہتے ہیں اور قدرت میں مضبوط و شدید کو متین کہا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: فَقَامَ مُمْتَنًّا یعنی حضور اقدس ﷺ نے پوری طاقت واستقامت سے قیام فرمایا۔ قرآن کریم میں یہ اسم پاک ایک ہی مقام' سورۃ الذاریات میں آیا ہے:﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا' قوت والا' زبردست ہے۔'' اللہ تعالیٰ متین ہے کہ وہ مستقل بالذات اور قائم بالذات خود ہی ہے' کسی دوسری طاقت کا محتاج نہیں۔ وہی تمام مخلوقات کو رزق رسانی کرتا ہے' وہی پروردگار انتھک طاقتوں والا اور لامحدود قوتوں والا ہے۔

(۴۷) اَلْوَلِیُّ

یہ اسم مبارک الولی (دوست' مددگار' کارساز' محبت کرنے والا)' ولاء سے ہے اور ولاء کے معنی محبت' صداقت' قرب' قرابت اور ملک کے ہیں۔ وَلِيَ يَلِي وَلْيًا: اس سے قریب ہوا یا اس کا پیروکار رہا۔ وَلِيَ وِلَايَةً و وَلَايَةً: اس پر قیام کیا' اس کا مالک ہوا' اس کی مدد کی۔ درج ذیل آیات پر غور کیجیے:﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۲) ''تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ املا کرا دے۔'' سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا﴾ (آیت ۳۳) ''اور جسے قتل کر دیا گیا مظلومی میں' تو اُس کے ولی کو ہم نے اختیار دیا ہے۔'' سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:﴿وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ﴾ ''اور جو ظالم (کافر ومشرک) ہوں گے ان کے لیے نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ کیا انہوں نے اللہ کے سوا کوئی اور حمایتی بنا لیے ہیں؟ سو حمایتی تو صرف اللہ ہی ہے۔'' سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (آیت ۲۵۷) ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا۔'' سورۃ السجدۃ میں ارشاد ہے:﴿مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ﴾ (آیت ۴) ''نہیں ہے تمہارے لیے اُس کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔'' سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اے وہ ہستی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے'

تُو ہی میرا کارساز ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھے وفات دیجیو فرمانبرداری کی حالت میں اور مجھے شامل کر دیجیو اپنے صالح بندوں میں۔'' سورۃ الکہف میں ارشاد ہے:﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾﴾ ''یہاں تو تمام اختیار اللہ ہی کا ہے جو الحق ہے وہی بہتر ہے انعام دینے میں اور وہی بہتر ہے عاقبت کے اعتبار سے۔'' سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے:﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ لوگ جو صاحبِ ایمان ہوں اور تقویٰ کی روش اختیار کریں۔'' سورۃ الحج میں ہے:﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾﴾ ''پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو' اور اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ وہ تمہارا مولیٰ ہے' تو کیا ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور کیا ہی اچھا ہے مددگار!''

بے شک اللہ تعالیٰ ہی ولی ہے اور بندوں کے سب کاموں کی تولیت اسی کو حاصل ہے۔ اُس کی ولایت بندے کو ایمان وتقویٰ اور عبودیت سے حاصل ہوتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ولی ہے اور اُسی کی ولایت اور محبت حاصل کرنے سے اللہ کے بندوں کو بھی اولیاء اللہ کا خطاب مل جاتا ہے۔ یہ وہ برگزیدہ بندے ہوتے ہیں جو ایمان اور تقویٰ میں درجۂ بلند رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ولی اور تدبیر وقدرت والا ہے' تصرف وملکیت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک مَوْلٰی سورۃ التحریم میں بھی آتا ہے:﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾﴾ ''اور اللہ تمہارا مددگار ہے' اور وہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔'' اس اسم پاک کے حوالے سے ایک جامع دعا ہے: يَا وَلِيَّ الْاِسْلَامِ وَاَهْلِهٖ ثَبِّتْنِيْ حَتّٰى اَلْقَاكَ ''اے اسلام اور اسلام والوں کے مددگار/کارساز! مجھے اسلام پر قائم اور ثابت قدم رکھنا' یہاں تک کہ میں تیرے حضور حاضر ہو جاؤں۔''

(جاری ہے) ❁❁❁

قارئین نوٹ فرمالیں کہ زیرِنظر شمارے سے میثاق کی قیمت اور صفحات میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ماہ رواں سے فی شمارہ قیمت 60 روپے اور سالانہ زرِتعاون 600 روپے ہے' جبکہ صفحات کی تعداد 100 ہے۔

Jan 2026
Vol.75

Regd. CPL No.115
No.1

Monthly **Meesaq** Lahore

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل ○ سفید کاغذ ○ معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 7000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

○ قرآنی رسم الخط ○ تفسیری سائز ○ عمدہ سفید کاغذ ○ مضبوط مرا کو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)